مذہب

اور

جدید چیلنج

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Mashab aur Jadid Challenge

by Maulana Wahiduddin Khan

English version: Islam and Modern Challenges
Malay version : Islam Menjawadd tantagen Zaman
Malayalam version : Islam Velluvilikkunnu
Sindhi Version : Jadid Ilm jo Challenge
Turkish Version: Jslam Meydan Okuyor
Araibc version : Al-Islam Yatahadda

Frist Published 1966
Reprinted 2011

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-1100013
email: info@goodwordbooks.com
Printed in India

See our complete catalouge at
www.goodwordbooks.com
www.goodword.net

فہرست

عرضِ ناشر

فروری 1955ء کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر مصنف کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد جب اعلان کیا گیا کہ وہ چھپی ہوئی صورت میں یہاں بُک اسٹال پر موجود ہے تو انسانوں کا ہجوم اس کو لینے کے لئے اسٹال پر ٹوٹ پڑا۔ تقریر کے مطبوعہ نسخے ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہو گئے۔ بعد کو یہ تقریر پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا نام تھا ''نئے عہد کے دروازہ پر'' ہندی میں ''نو یگ کے پردیش دوار پر'' اور انگریزی میں:

On the threshold of a new Era

یہ پہلا موقع تھا جب کہ مصنف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید الحاد کے جواب میں عصری انداز میں ایک کتاب تیار کرنی چاہئے۔ اس کے لئے مطالعہ اور مواد جمع کرنے کا کام اسی وقت سے شروع ہو گیا۔ اس کے بعض اجزاء متفرق طور پر بعض ماہناموں میں شائع ہوتے رہے۔ جمع شدہ مواد کی باقاعدہ کتابی ترتیب کا کام 1963 میں شروع ہوا اور اگست 1964 میں مکمل ہو گیا۔

یہ کتاب پہلی بار 1966 میں ادارہ تحقیقات ونشریاتِ اسلام (لکھنؤ) سے شائع ہوئی۔ اس کا عربی ترجمہ پہلی بار 1970 میں کویت کے ناشر ''دار البحوث العلمیہ'' نے الاسلام یتحدیٰ کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد وہ بیروت اور قاہرہ سے چھپتی رہی۔ اب تک اس کے ایک درجن اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسری کئی عالمی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔ ''الاسلام یتحدیٰ'' نصف درجن عرب یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہے۔

کتاب کی اشاعت کے بعد سیکڑوں تبصرے مختلف عالمی جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تبصرہ جزئی طور پر ٹائٹل کے آخری صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ تبصرہ معروف مصری ادیب احمد بہجت کے قلم سے ہے اس کو قاہرہ کے اخبار الاہرام (2/جولائی 1973) نے اپنے کالموں میں شائع کیا تھا۔

مخالفین مذہب کا مقدمہ

’’جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے، اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے، وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (Knoweledge Explosion) ہے، جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں۔‘‘(۱) یہ جولین ہکسلے کے الفاظ میں علم جدید کا چیلنج ہے، اور ان صفحات میں مجھے اسی چیلنج کا جواب دینا ہے، مصنف کا یقین ہے کہ علم کی روشنی مذہب کی صداقت کو اور زیادہ واضح کرنے میں مددگار ہوئی ہے، اس نے کسی بھی اعتبار سے مذہب کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، دور جدید کی ساری دریافتیں صرف اس بات کا عتراف ہیں کہ آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ آخری صداقت ہے اور آئندہ کی تمام انسانی معلومات اس کی صداقت کو اور مبرہن کرتی چلی جائیں گی، بالکل صحیح تھا۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۲)

ترجمہ: عنقریب ہم دکھائیں گے اپنی نشانیاں ان کو آفاق میں اور خود ان کے اندر یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، وہ انسان کی صرف اس خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہہ کرنا چاہتا ہے، توجیہہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذاتِ خود غلط نہیں ہے مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات

---

(۱) ہندوستان ٹائمس، سنڈے میگزین، 23/ ستمبر 1961ء

(۲) حٰم السجدۃ: 53

تک پہنچا دیا جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے، اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے، اسی طرح توجیہہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی ابتدائی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

آگسٹ کامٹے (August Comte) جو انیسویں صدی کے نصف اول کا فرانسیسی مفکر ہے، اس کے نزدیک انسان کی فکری ارتقا کی تاریخ تین مرحلوں میں تقسیم ہے، پہلا مرحلہ الٰہیاتی مرحلہ (Theological Stage) ہے، جب کہ واقعات عالم کی توجیہہ خدائی طاقتوں کے حوالے سے کی جاتی ہے، دوسرا مرحلہ مابعدالطبیعیاتی مرحلہ (Metaphysical Stage) ہے، جس میں متعین خدا کا نام تو باقی نہیں رہتا، پھر بھی واقعات کی توجیہہ کے لئے خارجی عناصر کا حوالہ دیا جاتا ہے، تیسرا مرحلہ ثبوتی مرحلہ (Positive Stage) ہے جبکہ واقعات کی توجیہہ ایسے اسباب کے حوالے سے کی جاتی ہے، جو مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت معلوم ہوتے ہیں، بغیر اسکے کہ کسی روحِ خدا یا مطلق طاقتوں کا نام لیا گیا ہو، اس فکر کی رو سے اس وقت ہم اسی تیسرے فکری دور سے گزر رہے ہیں، اور اس فکر نے فلسفہ میں جو نام اختیار کیا ہے وہ منطقی ثبوتیت (Logical Positivism) ہے۔

منطقی ثبوتیت یا سائنسی تجربیت Scientif) (ic Empiricim باقاعدہ تحریک کی شکل میں بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں شروع ہوئی، مگر ایک طرز فکر کی حیثیت سے یہ پہلے ذہنوں میں پیدا ہو چکی تھی، اس کی پشت پر ہیوم (Hume) اور مِل (Mill) سے لے کر رسل (Russel) تک درجنوں ممتاز مفکرین کے نام ہیں، اور اب ساری دنیا میں اپنے تبلیغی اور تحقیقی اداروں کے ساتھ وہ موجودہ زمانے کا اہم ترین طریق فکر بن چکا ہے۔

ڈکشنری آف فلاسفی (مطبوعہ نیویارک) میں اس طریق فکر کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

"Every knowledge that is factuala is connected with experiences

in such a way that verification or direct or indirect comfirmationan is possible." (P.285)

یعنی ہر وہ علم جو حقیقی ہے، وہ تجربات سے اس طور پر متعلق ہوتا ہے کہ اس کی جانچ، یا براہِ راست یا بالواسطہ طریقہ سے اس کی تصدیق حاصل کرنا ممکن ہو، اس طرح مخالفین مذہب کے نزدیک صورت حال یہ بنتی ہے کہ ارتقاء کے عمل نے انسان کو آج جس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچایا ہے، وہ عین اپنے طریق فکر کے اعتبار سے مذہب کی تردید ہے، کیوں کہ جدید ارتقاء یافتہ علم نے ہمیں بتایا ہے کہ حقیقت صرف وہی ہوسکتی ہے جو تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہو، جبکہ مذہب کی بنیاد حقیقت کے ایک ایسے تصور پر ہے جو سرے سے مشاہدے اور تجربے میں آ ہی نہیں سکتی، دوسرے لفظوں میں واقعات وحوادث کی الٰہیاتی توجیہہ ترقی یافتہ ذرائع سے ثابت نہیں ہوتی اس لئے وہ غیر حقیقی ہے۔

اس طریق فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہہ ہے، پہلے زمانے میں انسان کا علم چونکہ بہت محدود تھا، اسلئے واقعات کی صحیح توجیہہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اوراس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کر لئے، مگر ارتقا کے عالمگیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے، اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اٹکل پچّو عقائد پر ایمان رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیا کی حقیقت معلوم کی جائے، [1] چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا، اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کر لی گئی ہے، جدید طریق مطالعہ نے ہمیں بتادیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کو کوئی واقعی دریافت نہیں تھی، بلکہ یہ

---

(۱) منطقی ثبوتیت کی تنقید کو دوسری طرح یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ماضی کے علمائے مذاہب کی مثال ایسے شخص کی سی ہے، جس نے بیکار چک (Dud (Cheque) لکھ دیا ہو جس کے لئے بنک میں واقعی رقم موجود نہ ہو، یہ لوگ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہے، جس کے پیچھے معنویت کا سرمایہ نہیں، ''نا قابل تغیر حقیقت اعلیٰ'' قواعد زبان کی رو سے ایک صحیح جملہ ہے، مگر وہ ایک بے کار چک ہے جس کے پیچھے کوئی حقیقی سرمایہ نہیں۔''
Religion and the Scintific Outlook, P.20

محض دور لاعلمی کے قیاسات تھے جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے ہیں، جولین ہکسلے لکھتا ہے:۔21

"نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو، لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں، ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے، اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔"

religion without revelation, New york, 1958, p.58

یعنی طبیعیات، نفسیات اور تاریخ، تینوں علوم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جن واقعات کی توجیہہ کے لئے پچھلے انسان نے خدا اور دیوتا کا وجود فرض کر لیا تھا، یا مجرد طاقتوں کو ماننے لگا تھا، اس کے اسباب دوسرے تھے، مگر ناواقفیت کی وجہ سے وہ مذہب کی پراسرار اصطلاحوں میں بات کرتا رہا۔

1۔طبیعیاتی دنیا میں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے، جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابل تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے، کچھ قوانین ہیں، جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کر رہے ہیں، بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا، یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانون فطرت (Law of Nature) کا نام دیا گیا، اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر یہ تصور ختم ہو جاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی فعال اور قادر خدا ہے، جو اس کو چلا رہا ہے، زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہو سکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتداءً کائنات کو حرکت دی ہو، چنانچہ شروع میں لوگ محرّکِ اول کے طور پر خدا کو مانتے رہے، والٹیر نے

کہا کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا ہے، جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کر کے انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے، اوراسکے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، اسکے بعد ہیوم نے اس ''بے جان اور بے کار خدا'' کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے تو دیکھی ہیں، لیکن دنیائیں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں، اس لئے کیوں کر ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے، جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا، واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے، کہ یہ واقعہ کیوں ہوا، وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آجانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے، مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور کیسے ڈوبتا ہے، اس لئے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے جو سورج کو نکالتا ہے اور اس کو غروب کرتا ہے، اس طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا، اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا، اسکے متعلق یہ کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے، مگر اب جب کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے، تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لئے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت؟، اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی اَن دیکھی طاقت کام کر رہی ہے، وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آیا _____ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی جس کے لئے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کرلیا تھا۔ ''اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے۔'' _____ ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے۔

"If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

J. Huxley, Religion without Revelation

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

2۔اس کے بعد نفسیات کی تحقیق کی گئی تو اس نقطۂ نظر پر مزید یقین حاصل ہو گیا کیوں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مذہب، انسان کے اپنے لاشعور کی پیداوار ہے نہ کہ فی الواقع کسی خارجی حقیقت کا انکشاف، ایک عالم کے الفاظ میں:

"God is nothing but a projection of man on a cosmic screen."

یعنی خدا کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ کائناتی سطح پر انسان کی ہستی کا ایک خیالی انعکاس ہے، دوسری دنیا عقیدہ انسان کی اپنی آرزوؤں کی ایک خوبصورت تصویر Beautiful idealisation of Human Wishes سے [۱] زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، وحی والہام محض بچپن میں دبے ہوئے خیالات (Childhood repressions) کا ایک غیر معمولی اظہار ہیں۔

ان تمام خیالات کی بنیاد نظریۂ لاشعور پر قائم ہے، جدید تحقیق سے معلوم ہوا کہ انسان کا ذہن دو بڑے خانوں پر منقسم ہے، ایک خانہ وہ جس کو شعور کہتے ہیں، یہ ہمارے ان افکار کا مرکز ہے جو عام طور پر ہوش وحواس کی حالت میں شعوری طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرا خانہ لاشعور ہے، اس حصۂ ذہن کے خیالات عام طور پر ہمارے علم وحافظہ کے سامنے نہیں ہوتے مگر وہ اس کی تہ میں موجود رہتے ہیں، اور غیر معمولی حالات میں یا سوتے وقت خواب میں ظاہر ہوتے ہیں، انسان کے بیشتر خیالات اسی لاشعور کے خانے میں جا کر دفن ہو جاتے ہیں، اور اس اعتبار سے ذہن کا شعوری حصہ اس کے لاشعور سے بہت کم ہے، چنانچہ دونوں کا تناسب ظاہر کرنے کے لئے سمندر کے برفانی تودہ (Iceberg) کی

---

(۱) The Iqbal review, (Lahore), April, 1962

مثال دی جاتی ہے، جس کے نو حصے کئے جائیں تو آٹھ حصے پانی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور صرف ایک حصہ اوپر دیکھنے والوں کو نظر آئے گا (اگرچہ یہ تناسب بھی اضافی ہے)

فرائڈ نے طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا کہ بچپن میں انسان کے لاشعور میں کچھ ایسی چیزیں بیٹھ جاتی ہیں، جو بعد میں غیر عقلی رویے کا باعث بنتی ہیں، یہی صورت مذہبی عقائد کی ہے، مثلاً دوسری دنیا اور جنّت دوزخ کا تصور دراصل ان آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہے، جو بچپن میں آدمی کے ذہن میں پیدا ہوئیں، مگر حالات سازگار نہ ہونے کہ وجہ سے پوری نہیں ہوئیں اور دب کر لاشعور میں باقی رہ گئیں، بعد کو لاشعور نے اپنی تسکین کے لئے ایک ایسی دنیا فرض کر لی جہاں وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر سکے گا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنی ایک محبوب چیز کو واقعی دنیا میں نہ پاسکا تو وہ نیند کی حالت میں خواب دیکھتا ہے کہ وہ اس سے ہم کنار ہو رہا ہے، اسی طرح بچپن کی بہت سے باتیں جو لاشعور میں تہ نشیں ہو کر بظاہر حافظہ سے نکل گئی تھیں، وہ غیر معمولی حالات مثلاً جنون یا ہسٹریا میں یکا یک زبان پر جاری ہو گئیں تو سمجھ لیا گیا کہ یہ کوئی ماورائی طاقت ہے جو انسان کی زبان سے کلام کر رہی ہے، اسی طرح بڑے اور چھوٹے کے فرق اور (Father Complex) نے خدا اور بندے کا تصور پیدا کیا، اور جو چیز محض ایک سماجی برائی تھی، اس کو کائناتی سطح پر رکھ کر ایک نظریہ گڑھ لیا گیا۔ لنٹن (Ralph Linton) لکھتا ہے:۔

> ''ایک ایسے قادر مطلق کا تصور جس کے کام خواہ کتنے ہی غیر منصفانہ معلوم ہوں مگر وہ مکمل فرمانبرداری اور وفاداری ہی کے ذریعہ خوش کیا جا سکتا ہے، براہِ راست سامی عائلی نظام کی پیداوار تھا، اس عائلی نظام نے مبالغہ آمیز فوق الفطری انانیت کو جنم دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون موسوی کی شکل میں انسانی زندگی اور رویہ کے ہر پہلو کے متعلق محرمات کی ایک مفصل فہرست تیار ہو گئی، محرمات کا یہ سلسلہ ان لوگوں نے گرہ میں باندھ لیا جو بچپن میں اپنے باپ کے احکام کو یاد رکھنے اور احتیاط سے اس پر عمل

کرنے کے عادی ہو چکے تھے، خدا کا تصور مخصوص قسم کے سامی باپ کا پرتو ہے، جس کے اختیارات اور اوصاف میں تجرد اور مبالغہ پیدا کر دیا گیا ہے۔''

The tree of Culture, Ralph Linton
New York, AlfredA, knopf , 1956, p. 288

3۔ مذہب کے خلاف مقدمے کی تیسری بنیاد تاریخ ہے، مخالفین مذہب کا دعویٰ ہے کہ ہم نے تاریخ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مذہبی تصورات پیدا ہونے کی وجہ وہ مخصوص تاریخی حالات ہیں، جو اس سے پہلے انسان کو گھیرے ہوئے تھے، قدیم زمانے میں سائنس کی دریافتوں سے پہلے سیلاب، طوفان اور بیماری وغیرہ سے بچنے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا، وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ زندگی میں پاتا تھا، اس لئے اس نے اپنی تسکین کے لئے کچھ ایسی غیر معمولی طاقتیں فرض کر لیں جن کو وہ مصیبت کے وقت پکارے اور جن سے دفعِ بلا کی امید رکھے، اسی طرح سماج کے اندر باہمی پیوستگی پیدا کرنے اور ایک مرکز کے گرد لوگوں کو جوڑے رکھنے کے لئے بھی کسی چیز کی ضرورت تھی، یہ کام اس نے ایسے معبودوں سے لیا جو سارے انسانوں کے اوپر ہوں اور جن کی مرضی حاصل کرنا ہر ایک کے لئے ضروری ہو، وغیرہ غیرہ، علوم اجتماعی کی انسائیکلو پیڈیا میں مذہب (Religion) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

'' جس طرح دوسرے اسباب مذہب کو پیدا کرنے میں اثر انداز ہوئے ہیں، اسی طرح اس میں سیاسی اور تمدنی حالات کا بھی دخل رہا ہے، خداؤں کے نام اور ان کی صفات خود بخود وقت کے نظام سلطنت کی صورت میں ڈھل گئے، خدا کو بادشاہ ماننے کا عقیدہ محض انسانی بادشاہت کی بدلی ہوئی شکل ہے، اور آسمانی بادشاہت صرف زمینی بادشاہت کا ایک چربہ ہے، نیز چونکہ بادشاہ سب سے بڑا جج بھی ہوتا تھا، اسی طرح خدا کو بھی عدالت کی کارروائیاں سپرد کر دی گئیں اور یہ عقیدہ بن گیا کہ وہ انسان کی بدی یا نیکی کے بارے میں آخری فیصلہ کرے گا، اس قسم کا عدالتی تصور جو خدا کو محاسب اور مجازی مانتا ہے، اس نے نہ صرف یہودیت میں بلکہ

عیسائیت اور اسلام کے مذہبی نقطۂ نظر میں بھی مرکزی مقام حاصل کرلیا ہے۔''

Encylopaedia of Social Sciences, 1957, Vol. 13, p.233

اس طرح مخصوص تاریخی دور کے حالات اور ان حالات کے ساتھ انسانی ذہن کے باہمی تعامل نے وہ تصورات پیدا کئے جن کو مذہب کہا جاتا ہے ''مذہب انسانی ذہن کی پیداوار ہے جو عدم واقفیت اور خارجی قوتوں کے مقابلے میں بے سہارا ہونے کی ایک خاص حالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے'' جولین ہکسلے یہ ریمارک دیتا ہوا لکھتا ہے:

"Religion is the product of a certain type of anterction between man and his environment."

Man an the Modren World, p. 130

یعنی مذہب نتیجہ ہے، انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک خاص طرح کے تعامل کا، اب چونکہ وہ مخصوص ماحول ختم ہو گیا ہے، یا کم از کم ختم ہو رہا ہے، جو اس طرح کے تعامل کو وجود میں لانے کا ذمہ دار تھا، اس لئے اب مذہب کو زندہ رکھنے کی بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، وہ مزید لکھتا ہے:۔

''خدا کا تصور اپنی افادیت کے آخری مقام پر پہنچ چکا ہے، اب وہ مزید ترقی نہیں کرسکتا، مافوق الفطری طاقتیں دراصل مذہب کا بوجھ اٹھانے کے لئے انسانی ذہن نے اختراع کی تھیں، پہلے جادو پیدا ہوا، پھر روحانی تصرفات نے اس کی جگہ لی، پھر دیوتاؤں کا عقیدہ ابھرا اور اس کے بعد ایک خدا کا تصور آیا، اس طرح ارتقائی مراحل سے گزر کر مذہب اپنی آخری حد کو پہنچ کر ختم ہو چکا ہے کسی وقت یہ خدا ہماری تہذیب کے ضروری مفروضے اور مفید تخیلات تھے، مگر اب جدید ترقی یافتہ سماج میں وہ اپنی ضرورت اور افادیت کھو چکے ہیں۔'' (صفحہ ۱۳۱)

اشتراکی فلسفہ کے نزدیک بھی مذہب ایک تاریخی فریب ہے، البتہ اشتراکیت چونکہ تاریخ کا مطالعہ تمام تر اقتصادیات کی روشنی میں کرتی ہے، اس لئے اس نے تمام تاریخی

اسباب کوسمیٹ کرصرف اقتصادی اسباب میں مرکوز کردیا، اس کے نزدیک مذہب کوجن تاریخی حالات نے پیدا کیا وہ دورقدیم کا جاگیردارانہ اورسرمایہ دارانہ نظام تھا، اب چونکہ یہ فرسودہ نظام اپنی موت مررہاہے،اس لئے مذہب کوبھی اسی کے ساتھ ختم سمجھنا چاہئے ،انگلس کے الفاظ میں ’’تمام اخلاقی نظریے، اپنے آخری تجزیے میں، وقت کے اقتصادی حالات کی پیداوارہیں‘‘(۱) انسانی تاریخ طبقاتی لڑائیوں کی تاریخ ہےجس میں سربرآوردہ طبقہ پسماندہ طبقہ کا استحصال کرتارہاہے، اورمذہب واخلاق صرف اسلئے وضع کئے گئے تاکہ سربرآوردہ طبقہ کے مفادات کومحفوظ کرنے کے لئےنظریاتی بنیاد حاصل ہوسکے۔

’’قانون،اخلاق، مذہب،سب بورژوا کی فریب کاری ہے،جس کی آڑ میں اس کے بہت سے مفادات چھپے ہوئے ہیں۔‘‘ (کمیونسٹ مینی فسٹو)

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیسری کل روس کانگریس (اکتوبر 1920ء) میں لینن نے کہا تھا:۔

’’یقیناً ہم خدا کونہیں مانتے،ہم خوب جانتے ہیں کہ ارباب کلیسا، زمیندار اور بورژوا طبقہ جوخدا کے حوالے سے کلام کرتے ہیں وہ محض استحصال کرنے والے کی حیثیت سے اپنے مفادات کاتحفظ کرناچاہتے ہیں، ہم ایسے تمام اخلاقی ضابطوں کا انکارکرتے ہیں،جوانسانوں سے ماوراکسی مافوق طاقت سے اخذ کئے گئے ہوں یاطبقاتی تصور پر مبنی نہ ہوں، ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکاہے،ایک فریب ہے، زمینداروں اورسرمایہ داروں کے مفاد کے لئے مزدوروں اورکسانوں کی فکر پر پردہ ڈالنا (Befogging of the Minds) ہے،ہم کہتے ہیں کہ ہماراضابطۂ اخلاق تمام تر صرف پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کے تابع ہے، ہمارے اخلاقی اصول کا ماخذ پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کا مفاد ہے۔‘‘(لینن سلکٹڈ ورکس (ماسکو1947ء) جلد2 صفحہ 667)

---

(۱) Antzs Duhring,Moscow, 1954 ,p.131

یہ مخالفین مذہب کا وہ مقدمہ جس کی بنیا پر دور جدید کے بہت سے لوگ، عضویات کے ایک امریکی پروفیسر کے الفاظ میں کہتے ہیں:۔

Science has shown religion to be history,s cruelest and wickedest hoax.

یعنی سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ مذہب تاریخ کا سب سے زیادہ دردناک اور سب سے بدترین ڈھونگ تھا۔ (۱)

---

(۱) Quoted by C.A.Coulson, Science and Christian Belief, P.4

تبصرہ

پچھلے صفحات میں ہم نے ان مخالف مذہب استدلالات کا ذکر کیا ہے، جو اس بات کے ثبوت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ دورِ جدید نے مذہب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے، جدید طریقِ فکر نے مذہب کو کسی بھی درجہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، اگلے ابواب میں ہم مذہب کے بنیادی تصورات کو ایک ایک کر کے لیں گے اور دکھائیں گے کہ کس طرح مذہب آج بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے، جیسے کہ وہ پہلے تھا، یہاں گزشتہ دلائل پر ایک عمومی تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

1۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس دلیل کو لیجئے، جو طبیعیاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں، وہ ایک متعین قانونِ فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں، اسلئے ان کی توجیہہ کرنے کے لئے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہہ کے لئے موجود ہیں، اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا ہے، اس نے کہا۔

"Nature is a fact,not an explanation"

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے، تمھارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لئے ہیں، مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے وہ اس مسئلے کا جواب نہیں، جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا ہے، مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں، جب کہ تمھاری دریافت صرف اس مسئلہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہماری سامنے کھڑی نظر آتی

ہے،اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے، جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے، نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہہ،سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیا ہے'' یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ ''جو کچھ ہے، وہ کیوں ہے'' جب کہ توجیہہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے،مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے، اوراس کے ٹوٹنے سے باہرآتا ہے، یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہرنکل آئے ،پہلے انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ ''خداایسا کرتا ہے'' مگراب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ 21 روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے،اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سے سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے،اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہرآجاتا ہے،سینگ اپنا کام پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظرئے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے، کیوں کہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک 21 روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں، جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں، مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں، جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے، وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا، اس مشاہدہ کے صورت حال میں جو فرق پیدا ہوا ہے، وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ ''سینگ'' کے اوپر جا کر ٹھہر گیا، بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے، واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی ،دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگائیں، جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لئے کسی سخت

مددگار کی ضرورت ہے، اوراس نے مادہ کومجبور کیا کہ عین اس وقت پرٹھیک 21روز بعد بچہ کی چونچ پرایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہوجواپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے ، گو یا پہلے یہ سوال تھا کہ ''خول کیسے ٹوٹتا ہے'' اوراب سوال یہ ہوگیا کہ ''سینگ کیسے بنتی ہے'' ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ،اس کوزیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں حقیقت کی توجیہہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات (Cecil Boyec Hamann) کے الفاظ نقل کروں گا

> ''غذا ہضم ہونے اوراس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردِعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہوگئی ،آخرکون طاقت ہے ،جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردِعمل ظاہر کریں ،غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے، کہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا،حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا ہے،جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔''

The evidence of God in an Exapanding Universe ,P.221

اس سے آپ جدید دریافتوں کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھادیا ہے، اس نے دکھادیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں ،جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے ،اورجس کے تحت وہ حرکت کررہی ہے، مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے، مگراب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پرگرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہوگیا ہے، جس کے

مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے، مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہہ نہیں ہیں، سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے، وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین وآسمان میں قائم ہیں، اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کئے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعویٰ کرنے لگا ہے اس نے کائنات کی توجیہہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکا ہے، یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے، یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے، یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا۔

" Nature does not explain ,she herself is need of an explanation."

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لئے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے، تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے چھوٹے سرخ اجزا ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصہ کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

''درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں۔''

''ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے، جس کا نام ہیموگلوبن (Haemoglobin) ہے، یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آئے۔''

''وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے، مگر مجھے بتایئے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرات، تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کُل کے اندر باہم باہم مربوط ہیں، اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں۔''

''یہ قدرت کا قانون ہے۔''

''وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانون قدرت کہتے ہیں۔''

''اس سے مراد(Bind anterplay of physical and chemical forces) طبیعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل ہے۔

''مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہیں، جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے، کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے، ایک مچھلی تیر سکے، ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔''

''میرے دوست مجھ سے یہ نہ پوچھو، سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کیا ہے، اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔''

یہ سوال و جواب واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے، بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں، مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں، اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں کھربوں گنا بڑھ جائیں، جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی، کیوں کہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں اور ان کا آخری سبب کیا ہے، اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے، یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں، جبکہ مذہب کی جگہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کر لے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی ہے، اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکّر کس طرح اور ایک چکّر سے چل رہا ہے، اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے، یہاں تک کہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری

حرکت دیکھ لیں، مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا، کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے، اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا، اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے، ہیریز (A.Harris) نے یہی بات کہی تھی، جب اس نے ڈارونزم پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

" Nature selection may explain the survival of the fittest, but cannot explain the arrival of the fittest,"

Revolt Against Reason by A.Lunn, P.133

یعنی انتخاب طبیعی کے قانون کا حوالہ صرف زندگی کے بہتر مظاہر کے باقی رہنے کی توجیہہ کرتا ہے، وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

2۔ اب نفسیاتی استدلال کو لیجئے، کہا جاتا ہے کہ خدا اور دوسری دنیا کا تصور کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی شخصیت اور انسانی آرزوؤں کو کائناتی سطح پر قیاس کرنا ہے، لیکن میرے لئے ناقابل تصور ہے کہ اس میں استدلال کا پہلو کیا ہے، اس کے جواب میں اگر میں کہوں کہ فی الواقع انسانی شخصیت اور انسانی آرزوئیں کائناتی سطح پر موجود ہیں تو مجھے نہیں معلوم کہ مخالفین کے پاس وہ کون سی حقیقی معلومات ہیں جن کی بنیاد پر وہ اس کی تردید کر سکیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ جنین کا خوردبینی مادہ چھ فٹ لمبے چوڑے انسان کی سطح پر ایک شخص کی موجودگی کی پیشین گوئی ہے، ناقابل مشاہدہ ایٹم میں وہ نظام پایا جاتا ہے، جو شمسی نظام کی سطح اربوں میل کے دائرے میں گردش کر رہا ہے، پھر شعور جس کا ہم انسان کی صورت میں تجربہ کر رہے ہیں، وہ اگر کائناتی سطح پر زیادہ مکمل حالت میں موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اسی طرح ہمارا ضمیر اور ہماری فطرت جس ارتقا یافتہ دنیا کو چاہتے ہیں وہ اگر ایک ایسی

دنیا کی بازگشت ہو جو فی الواقع کائنات کے پردہ میں موجود ہے تو اس میں آخر استحالہ کا کیا پہلو ہے۔

الف: علمائے نفسیات کا یہ کہنا بجائے خود صحیح ہے کہ بچپن میں بعض اوقات ایسی باتیں ذہن میں پڑ جاتی ہیں جو بعد کو غیر معمولی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، مگر اس سے یہ استدلال کرنا کہ انسان کی یہی وہ خصوصیت ہے، جس نے مذہب کو پیدا کیا، بالکل بے بنیاد قیاس ہے، یہ ایک معمولی واقعہ سے غیر معمولی نتیجہ اخذ کرنا ہے، یہ ایسی ہی بات ہے، جیسے میں کسی کمہار کو مٹی کی مورت بناتے ہوئے دیکھوں تو پکار اٹھوں کہ بس یہی وہ شخص ہے، جو ذی روح انسان کا خالق ہے ،کمہار بیشک مٹی کے کھلونوں کا صانع ہے، مگر یہ کہنا کہ اسی طرح کوئی اور کمہار تھا، جس نے خود اس کمہار کو بنایا، ایک لغو بات کے سوا اور کچھ نہیں۔

جدید طرزِ فکر کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ معمولی واقعہ سے غیر معمولی استدلال کرتا ہے، حالانکہ منطقی اعتبار سے اس استدلال میں کوئی وزن نہیں، اگر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کے تحت کبھی ''غیر معمولی'' باتیں بڑبڑانے لگتا ہے، تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ انبیاء کی زبان سے کائنات کے جس علم کا انکشاف ہوا ہے، وہ بھی اسی قسم کی ایک بڑبڑاہٹ ہے، پہلے واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں اس سے دوسرے واقعہ کے بارے میں استدلال کرنا ایک غیر علمی اور غیر منطقی روش کا مظاہرہ کرنا ہے، یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ توجیہہ کرنے والے کے پاس نبی کے غیر معمولی کلام کو سمجھنے کے لئے کوئی اور معیار موجود نہیں تھا، اس کو ایک ہی بات معلوم تھی ـــــــــ یہ کہ بعض مرتبہ کوئی شخص خواب یا جنون یا بے ہوشی کی حالت میں کچھ ایسی باتیں زبان سے نکالنے لگتا ہے جو عام طور پر ہوش کی حالت میں کسی کی زبان سے ادا نہیں ہوتیں، اس نے فوراً کہہ دیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جو مذہبی قسم کی باتوں کی ذمہ دار ہے، حالانکہ کسی کے پاس حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بطور واقعہ بھی حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہوگا۔

فرض کیجئے دور کے کسی سیارہ سے ایک ایسی مخلوق زمین پر اترتی ہے، جو سنتی تو ہے مگر بولنا نہیں جانتی وہ صرف سماعت کی صفت سے آشنا ہے، تکلم کی صفت کی اسے کوئی خبر نہیں ہے، وہ انسان کی گفتگو اور تقریریں سن کر یہ تحقیق شروع کرتی ہے کہ ''آواز'' کیا ہے، اور کہاں سے آتی ہے، اس تحقیق کے دوران اس کے سامنے یہ منظر آتا ہے کہ درخت کی دوشاخیں جو باہم ملی ہوئی تھیں، اتفاقاً ہوا چلی اور رگڑ سے ان میں آواز نکلنے لگی، پھر جب ہوا رکی تو آواز بند ہوگئی، یہ واقعہ بار بار اس کے سامنے آتا ہے، اب ان میں کا ایک ''ماہر'' بغور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ کلام انسانی کا راز معلوم ہوگیا، اصل بات یہ ہے کہ انسان کے منھ میں نیچے اور اوپر کے جبڑوں میں دانت کی موجودگی اس کا سبب ہے، جب یہ نیچے اوپر کے دانت باہم رگڑ کھاتے ہیں تو ان سے آواز نکلتی ہے، اور اسی کو کلام کہا جاتا ہے_____ دو چیزوں کی رگڑ سے ایک قسم کی آواز پیدا ہونا بجائے خود ایک واقعہ ہے، مگر اس واقعہ سے کلام انسانی کی تشریح کرنا جس طرح صحیح نہیں ہے، اسی طرح غیر معمولی حالات میں لاشعور سے نکلی ہوئی باتوں سے کلامِ نبوت کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔

ب: لاشعور میں جو خیالات دبا دیے جاتے ہیں وہ اکثر اوقات ایسی ناپسندیدہ خواہشیں ہوتی ہیں، جو خاندان اور سماج کے خوف سے پوری نہیں ہوسکیں، مثلاً کسی کے اندر اپنی بہن یا لڑکی کے ساتھ جنسی جذبہ پیدا ہو تو وہ اس خیال سے اسے دبا دیتا ہے کہ اس کا ظاہر کرنا رسوائی کا باعث ہوگا، اگر ایسا نہ ہوتو تو وہ شاید اس کے ساتھ شادی کرنا پسند کرتا، کسی کو قتل کرنے کا خیال ہو تو آدمی اس ڈر سے اپنے ذہن میں دفن کر دیتا ہے کہ اس کو جیل جانا پڑے گا وغیرہ وغیرہ، گویا لاشعور میں دبی ہوئی خواہشیں اکثر اوقات وہ برائیاں ہوتی ہیں، جو ماحول کے خوف سے بروئے کار نہ آسکیں، اب اگر ایسے کسی شخص میں ذہنی اختلال (Mental Disorder) پیدا ہو اور اس کا لاشعور ظاہر ہونا شروع کرے تو اس سے کیا ظاہر ہوگا، ظاہر ہے کہ وہی برے جذبات اور غلط خواہشیں اس کی زبان سے نکلیں گی جو اس

کے لاشعور میں بھری ہوئی تھیں، وہ شر کا پیغمبر ہوگا، خیر کا پیغمبر نہیں ہوسکتا، اس کے برعکس انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا ظہور ہوا ہے، وہ سرتاپا خیر اور پاکیزگی ہے، ان کا کلام اور ان کی زندگی خیر اور پاکیزگی کا اتنا اعلیٰ نمونہ ہے کہ انبیاء کے سوا کہیں اس کی مثال نہیں ملتی، یہی نہیں بلکہ ان کے خیالات میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہی سماج کے خوف سے انھوں نے کبھی اپنے خیالات اپنے ذہن میں چھپالئے تھے، وہ اس پر دل وجان سے فریفتہ ہوجاتا ہے، اور صدیوں پر صدیاں گزر جاتی ہیں، پھر بھی انھیں نہیں چھوڑتا۔

ج: نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کا لاشعور اصلاً خلا (vecuum) ہے، اس میں پہلے سے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی بلکہ شعور کی راہ سے گزر کر پہنچتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ لاشعور صرف انھیں واردات اور معلومات کا گودام ہے، جو کبھی انسان کے علم میں آیا ہو، وہ نامعلوم حقائق کا خزانہ نہیں بن سکتا، لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے، کہ انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا اعلان ہوا ہے، وہ ایسی حقیقتوں پر مشتمل ہے، جو وقتی نہیں، دائمی ہیں، وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہ تو انھیں پہلے سے معلوم تھیں نہ ان کے وقت تک پوری نسل انسانی کو معلوم ہوسکی تھیں، اگر حقائق کا سرچشمہ لاشعور ہوتا تو وہ ہرگز ایسے نامعلوم حقائق کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا ظہار ہوا ہے اس میں فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات، تاریخ تمدن، سیاست، معاشرت، غرض سارے ہی علوم کسی نہ کسی اعتبار سے مَس ہوتے ہیں، ایسا ہمہ گیر کلام لاشعور تو درکنار شعور کے تحت بھی اب تک کسی انسان سے ظاہر نہیں ہوا جس میں غلط فیصلے، خام اندازے، غیر واقعی بیانات اور ناقص دلائل موجود نہ ہوں، مگر مذہبی کلام حیرت انگیز طور پر اس قسم کے تمام اغلاط سے بالکل پاک ہے، وہ اپنی دعوت، اپنے استدلال اور اپنے فیصلوں میں تمام انسانی علوم کو چھوتا ہے، مگر سیکڑوں، ہزاروں برس گزر جاتے ہیں، اگلی نسلوں کی تحقیق پچھلی نسلوں کے خیالات کو بالکل بے بنیاد ثابت کردیتی ہے، مگر مذہب کی صداقت پھر بھی باقی رہتی ہے، آج تک حقیقی معنوں میں اس کے اندر کسی غلطی

کی نشاندہی نہ ہوسکی اگر کسی نے ایسی جرأت کی ہے تو وہ خود ہی غلط کار ثابت ہوا ہے۔

میں ایک کتاب (1935ء) کی مثال دیتا ہوں جس میں ایک ماہر فلکیات نے انتہائی یقین کیساتھ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس نے قرآن میں ایک فنی غلطی ڈھونڈ نکالی ہے، جیمز ہنری بریسٹڈ (James Henry Breasted) لکھتا ہے:

''مغربی ایشیا کی قوموں میں طویل مدت کے رواج اور خاص طور پر اسلام کے غلبہ نے قمری کیلنڈر کو دنیا بھر میں رائج کر دیا، قمری اور شمسی سال کے درمیان فرق کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس انتہائی لغو حد تک لے گئے جو کہ تصور کیا جا سکتا ہے، وہ کیلنڈر کے مسائلکی نوعیت سے اتنا زیادہ بے خبر تھے کہ قرآن میں باضابطہ انھوں نے کبیسہ کے مہینے (Intercalary Months) کا ٹھہرانا ممنوع قرار دے دیا، 354 دنوں کا نام نہاد قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنی گردش میں ہر 33 سال میں ایک سال اور ہر صدی میں تین سال زیادہ ہوجاتا ہے، ایک ماہانہ مذہبی عمل جیسے رمضان اگر اس وقت جون میں ہو تو چھ (6) سال بعد وہ اپریل میں آئے گا، (1935ء) میں ہجرت کو 1313 سال گزر چکے ہیں، جب سے کہ ہجری سال شروع ہوا، مگر ہماری ہر ایک صدی مسلمانوں کے قمری سال کے اعتبار سے ایک سو تین سال سے زیادہ کی ہوتی ہے، ہمارے عام شمسی سالوں کے اعتبار سے جب 1313 سالا ہوتے ہیں تو مسلم سال کے اعتبار سے تقریباً اکتالیس (41) سال زیادہ ہو چکے ہوتے ہیں، اس طرح مسلمانوں کا سال ہجری وقت تحریر 1354 تک پہنچ چکا ہے، یعنی شمسی اعتبار سے 1313 سالوں میں 41 سال مزید، مشرقی ملکوں کے یہودی چرچ نے اس قسم کی لغویت (Absurdity) کو ختم کر کے لوندیا مہینوں کے اضافہ کا طریقہ (Intercalation) کو اختیار کیا اور اس طرح اپنے قمری کیلنڈر کو شمسی سال کے ڈھانچہ کے مطابق بنالیا، اس بنا پر تمام مغربی ایشیا اب تک اس انتہائی قدیم طریقے قمری کیلنڈر کی زحمت کو برداشت کر رہا ہے۔''

Time and its Mysteries, New York. 1962, P56

یہاں مجھے شمسی اور قمری کیلنڈر کے فرق پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مصنف نے جس واقعہ کو پیغمبر اسلام کی طرف منسوب کر کے ''انتہائی لغو بے خبری'' کا الزام لگایا ہے، وہ واقعہ بذاتِ خود صحیح نہیں، قرآن میں جس چیز کی ممانعت کی گئی ہے، وہ کبیسہ کے مہینے ٹھہرانا نہیں بلکہ ''نسیٔ'' ہے، (توبہ 37) نسیٔ کے معنی عربی زبان میں تاخیر کے ہیں، یعنی موخر کرنا ہٹانا، مثلاً حوض پر ایک جانور پانی پی رہا ہے، اور آپ نے اس کو ہٹا کر اپنے جانور کو حوض پر کھڑا کر دیا کہ پہلے آپ کا جانور پانی پی لے، اس کے بعد دوسرا پیئے، تو اس طرح ہٹانے کو کہیں گے، ''نَسَأَ الدَّابَّةَ''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے عرب میں جو طریقے رائج ہوئے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ''اشہر حرم'' (خاص ادب واحترام کے مہینے) ہیں، یہ مہینے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب تھے، ان میں خونریزی اور جدال وقتال قطعاً بند کر دیا جاتا تھا، لوگ حج وعمرہ اور کاروبار کے لئے امن وامان کے ساتھ آزادانہ سفر کر سکتے تھے، بعد کو جب قبائل عرب میں سرکشی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس قانون کی پابندی سے بچنے کے لئے نسیٔ کی رسم نکالی، یعنی جب کسی زور آور قبیلہ کی خواہش ماہ محرم میں جنگ کرنے کی ہوئی تو ایک سردار نے اعلان کر دیا کہ امسال ہم نے محرم کو اشہرِ حُرم سے نکال کر اس کی جگہ صَفر کو حرام کر دیا، دوسرے لفظوں میں محرم کو اپنی جگہ سے ہٹا کر صفر کی جگہ رکھ دیا، یہی محترم مہینوں کو آگے پیچھے کرنے کی رسم تھی، جس کو نسیٔ کہا جاتا تھا، اور اسی کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ ''زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ'' ہے

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ عربوں میں ''لوند'' کی بھی ایک قسم کا رواج تھا، یعنی مہینوں کا عدد بدل دیتے تھے، مثلاً بارہ مہینے کے چودہ بنا لئے، مگر ایک مفسر قرآن کے الفاظ ہیں:۔

''بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لئے لوند کا مہینہ ہر تیسرے

سال بڑھاتی ہیں، وہ نسیٔ میں داخل نہیں۔‘‘

معلوم ہوا کہ دورِ بے خبری میں بھی پیغمبرؐ خدا نے بے خبری کی بات نہیں کہی، حالانکہ اگر ان کے الفاظ محض شعور یا لاشعور سے نکلے ہوئے ہوتے تو اس قسم کی بے خبری کا ظاہر ہونا لازمی تھا، (اگلے ابواب میں تفصیلی مثالیں آرہی ہیں۔)

3۔ تاریخ یا سماجی مطالعہ کے حوالے سے استدلال کرنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ صحیح رخ سے مذہب کا مطالعہ نہیں کرتے، اس لئے پورا مذہب ان کو اصل حقیقت کے خلاف ایک اور ہی شکل میں نظر آنے لگتا ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چوکور چیز کو کوئی شخص ترچھا کھڑا ہو کر دیکھے، ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو وہی چیز جو حقیقۃً چوکور ہے، تکونی نظر آسکتی ہے۔

ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ وہ مذہب کا مطالعہ ایک معروضی مسئلہ (Objective Problem) کے طور پر کرتے ہیں، [۱] یعنی ظاہری طور پر مذہب کے نام سے جو کچھ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے، ان سب کو مذہب کے اجزا سمجھ کر یکساں حیثیت سے جمع کر لینا اور پھر ان کی روشنی میں مذہب کے بارے میں یک رائے قائم کرنا، اس کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر ان کی پوزیشن غلط ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب ان کی نظروں میں محض ایک سماجی عمل بن جاتا ہے، نہ کہ کوئی انکشاف حقیقت، ایک چیز جو انکشاف حقیقت کی نوعیت رکھتی ہو، وہ بذاتِ خود ایک آئیڈیل ہوتی ہے، اور اس کے اپنے آئیڈیل کی روشنی میں اس کے مظاہر اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے، اس کے برعکس جو چیز سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہو، اس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا بلکہ سماج کا عمل ہی اس کی حقیقت کا تعین کرتا ہے، کوئی چیز جو سماجی آداب یا سماجی روایات کی حیثیت رکھتی ہو، اس کی یہ حیثیت صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے، جب تک سماج نے بالفعل اس کو یہ حیثیت دے رکھی ہو، اگر سماج اس

---

(۱) J.Huxly ,Man an the Modren World,P.129

کو چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی اور طریقہ اختیار کر لے تو پھر وہ ایک تاریخی چیز ہو جاتی ہے اور سماجی روایت کی حیثیت سے اس کا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔

مگر مذہب کا معاملہ اس سے مختلف ہے، مذہب کا مطالعہ ہم اس طرح نہیں کر سکتے، جس طرح ہم سواری اور لباس اور مکان مطالعہ کرتے ہیں، کیوں کہ مذہب اپنی ذات میں ایک حقیقت ہے جس کو سماج اپنے ارادہ سے قبول کرتا ہے یا اسے قبول نہیں کرتا یا قبول کرتا ہے تو ناقص شکل میں، اس کی وجہ سے مذہب اپنی اصولی حیثیت میں تو ہمیشہ یکساں رہتا ہے، مگر سماج کے اندر رواج یافتہ ہیئت کے اعتبار سے اس کی شکلیں مختلف ہو جاتی ہیں، اس لئے سماج کے اندر رواج یافتہ مذاہب کی یکساں فہرست بندی کر کے ہم مذہب کو سمجھ نہیں سکتے۔

مثال کے طور پر جمہوریت کو لیجئے جمہوریت ایک مخصوص سیاسی معیار کا نام ہے، اور کسی حکومت کو اس معیار کی روشنی ہی میں جمہوری یا غیر جمہوری کہا جا سکتا ہے، یعنی جمہوریت کے اپنے معیار کی رو سے تمام ملکوں کو دیکھا جائے گا، اور صرف اسی رویہ کو جمہوری قرار دیا جائے گا جو حقیقۃً جمہوری ہو، اس کے برعکس اگر جمہوریت کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ ہر وہ ملک جس نے اپنے نام کے ساتھ ''جمہوری'' کا لفظ لگا رکھا ہے، اس کو حقیقۃً جمہوری فرض کر کے جمہوریت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پھر جمہوریت ایک بے معنی لفظ بن جائے گا، کیونکہ ایسی حالت میں امریکہ کی جمہوریت چین کی جمہوریت سے مختلف ہوگی، انگلینڈ کی جمہوریت مصر کی جمہوریت سے ٹکرائے گی، ہندوستان کی جمہوریت کا پاکستان کی جمہوریت سے کوئی جوڑ نہیں ہوگا، اس کے بعد جب ان سارے مشاہدات کو ارتقائی ڈھانچہ میں رکھ کر دیکھا جائے گا تو وہ اور زیادہ بے معنی ہو جائے گا، کیوں کہ فرانس جو جمہوریت کا مقام پیدائش ہے، اس کا مطالعہ بتائے گا کہ جمہوریت اپنے بعد کے ارتقائی مرحلہ کے مطابق نام ہے، جنرل ڈیگال (1970۔1890) کی فوجی آمریت کا۔

اس طریق مطالعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہب کے لئے خدا کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی، مذہب کی ''تاریخ'' میں اس کی مثال موجود ہے کہ مذہب خدا کے بغیر بھی ہوسکتا ہے، یہ مثال بدھ دھرم کی ہے، جو ''مذہب'' ہونے کے باوجود خدا کے تصور سے خالی ہے، اس لئے آج بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مذہب کا مطالعہ خدا سے الگ کرکے کیا جانا چاہیئے، اگر اس ضرورت کو تسلیم کرلیا جائے کہ لوگوں کے اندر اخلاق اور تنظیم پیدا کرنے کے لئے مذہبی نوعیت کی کوئی چیز ضروری ہے تو اس مقصد کے لئے لازمی طور پر خدا کو ماننا ضروری نہیں، بے خدا مذہب بھی اس ضرورت کو پورا کرسکتا ہے، چنانچہ یہ لوگ بدھزم کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ اب موجودہ ترقی یافتہ دور میں اس قسم کا مذہبی ڈھانچہ سماج کے لئے زیادہ موزوں ہے، ان حضرات کے نزدیک دورِ جدید کا خدا خود سماج اور اس کے سیاسی اور معاشی مقاصد ہیں، اس خدا کا پیغمبر پارلیمنٹ ہے، جس کے زریعہ وہ اپنی مرضی سے انسانوں کو باخبر کرتا ہے، اور اس کی عبادت گاہیں، مسجد اور گرجا نہیں بلکہ ڈیم اور کارکانے ہیں، وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو جولین ہکسلے کی کتاب ''مذہب بغیر الہام'')

مذہب کو اقرارِ خدا سے انکارِ خدا تک پہنچانے میں نام نہاد ارتقائی مطالعہ کا بھی دخل ہے، یہ حضرات یہ کرتے ہیں کہ پہلے ان تمام چیزوں کو جمع کر لیتے ہیں جو کبھی مذہب کے نام سے منسوب رہی ہیں، اور اس کے بعد اپنی مرضی کے مطابق ان کے درمیان ایک ارتقائی ترتیب قائم کر لیتے ہیں، جس میں ایسے تمام پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے ان کی مزعومہ ارتقائی ترتیب مشتبہ ہوسکتی ہو، مثلاً انسانیات (ontology) اور سماجیات (Sociology) کے ماہرین نے زبردست مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ ''دریافت'' کیا ہے کہ خدا کا تصور کئی خداؤں سے شروع ہوا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ایک خدا تک پہونچا، لیکن یہ ترقی ان کے نزدیک الٹی ہوئی ہے، کیونکہ خدا کے تصور نے ایک خدا کی شکل اختیار کرکے اپنے آپ کو تضاد میں مبتلا کرلیا ہے، ''کئی خدا'' کا تصور کم از کم اپنے اندر یہ قدرت رکھتا تھا کہ مختلف

خداؤں کو ماننے والے ایک دوسرے کو تسلیم کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہیں مگر ''ایک خدا'' کے عقیدے نے قدرتی طور پر تمام دوسرے خداؤں اوران کو ماننے والوں کو باطل ٹھہرایااور برتر مذہب Higher Religion کا تصور پیدا کیا جس کی وجہ سے قوموں اور گروہوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی جنگیں شروع ہوگئیں، اس طرح خدا کے تصور نے غلط سمت میں ارتقا کر کے خود ہی اپنے لئے موت کا سامان مہیا کر دیا ہے، کیوں کہ ارتقاء کا قانون یہی ہے۔ Man in the Modren World, P.112

مگراس ارتقائی ترتیب میں صریح طور پر اصل واقعہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، کیوں کہ معلوم تاریخ کے مطابق سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوحؑ تھے، اوران کی دعوت کے متعلق ثابت ہے کہ وہ ایک خدا کی دعوت تھی ،اس کے علاوہ تعددآلہہ (Polytheism) کا مطلب بھی مطلق تعدد نہیں ہے، کبھی کوئی قوم ان معنوں میں مشرک نہیں رہی ہے کہ وہ بالکل یکساں نوعیت کے کئی خدا مانتی ہو، اس کے برعکس تعدد آلہہ کا مطلب ایک بڑے خدا کو مان کر کچھ اس کے مقربین خاص کا اقرار کرنا ہے، جو ذیلی خداؤں کے طور پر کام کرتے ہیں، شرک کے ساتھ ہمیشہ ایک ''خدائے خدائگان'' کا تصور پایا جاتا رہا ہے، ایسی حالت میں ''ارتقائی مذہب'' ایک بے دلیل عقیدہ کے سوااور کیا ہے۔______

مارکسی نظریۂ تاریخ اورزیادہ لغو ہے، یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی حالات ہی وہ اصل عامل ہیں، جو انسان کی تعمیر وتشکیل کرتے ہیں، مذہب جس زمانے میں پیدا ہوا وہ جاگیرداری اورسرمایہ داری نظام کا زمانہ تھا، اب چونکہ جاگیرداری اورسرمایہ داری نظام استحصال اورلوٹ کھسوٹ کا نظام ہے ،اس لئے اس کے درمیان پیدا ہونے والے اخلاقی ومذہبی تصورات بھی یقینی طور پر اپنے ماحول ہی کا عکس ہوں گے وہ لوٹ کھسوٹ کے نظریات ہوں مگر یہ نظریہ علمی حیثیت سے کوئی وزن رکھتا ہے، اورنہ تجزیہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ نظریہ انسانی ارادہ کی بالکلیہ نفی کر دیتا ہے، اوراس کو صرف معاشی حالات کی

پیداوار قرار دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کوئی ہستی نہیں، جس طرح صابن کے کارخانے میں صابن ڈھلتے ہیں، اسی طرح آدمی بھی اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھلتا ہے، وہ الگ سے سوچ کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے، اسی کے مطابق سوچنے لگتا ہے، اگر یہ واقعہ ہے تو مارکس، جو خود بھی ''سرمایہ دارانہ نظام'' کے اندر پیدا ہوا تھا، اس کے لئے کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اپنے وقت کے معاشی حالات کے خلاف سوچ سکے، کیا اس نے زمین کا مطالعہ چاند پر جا کر کیا تھا، اگر مذہب کو پیدا کرنے والی چیز وقت کا اقتصادی نظام ہے تو آخر مارکسزم بھی وقت کے اقتصادی نظام کی پیداوار کیوں نہیں ہے، مذہب کی جو حیثیت مارکسزم کو تسلیم نہیں ہے، وہی حیثیت اس کے اپنے لئے کس طرح جائز ہوگی ______ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ اشتعال انگیز حد تک لغو ہے، اس کے پیچھے کوئی بھی علمی اور عقلی دلیل موجود نہیں۔

تجربے سے بھی اس نظریئے کی غلطی واضح ہو چکی ہے، روس کی مثال اس کو سمجھنے کے لئے کافی ہے، جہاں تقریباً آدھی صدی سے اس نظریہ کو مکمل غلبہ حاصل ہے، طویل ترین مدت سے زبردست پروپیگنڈہ ہو رہا ہے، کہ روس کے مادی حالات بدل گئے ہیں، وہاں کا نظام پیداوار، نظام تبادلہ اور نظامِ تقسیم دولت سب غیر سرمایہ دارانہ ہو چکا ہے، مگر اسٹالن کے مرنے کے بعد خود روسی لیڈروں کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے کہ اسٹالن کے زمانۂ حکومت میں روس کے اندر ظلم و جبر کا نظام رائج تھا، اور عوام کا اسی طرح استحصال کیا جا رہا تھا، جیسے سرمایہ دارانہ ملکوں میں ہوتا ہے، اور اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ روس میں پریس پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہونے کی وجہ سے اسٹالن کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنے ظلم اور استحصال کو دنیا کے سامنے عدل و انصاف کے نام سے مشہور کرے، اور پریس کا یہی کنٹرول اب بھی وہاں جاری ہے، تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے آج بھی خوبصورت پروپیگنڈے کے پس منظر میں روس کے اندر وہی سب کچھ ہو رہا ہے، جو اسٹالن کے زمانے میں ہوتا تھا، روسی

کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس (فروری 2956ء) نے اسٹالن کے مظالم کا انکشاف کیا تھا، اس کے بعد اگر پارٹی کی کوئی اور کانگریس خروشچیف کی درندگی کا راز فاش کرے تو اس میں ہرگز اچنبھے کی کوئی بات نہ ہوگی (۱) ــــــــ آدھی صدی کے اس تجربے سے جو نتیجہ نکلا ہے، اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ پیداوار اور تبادلہ کی نام نہاد تبدیلی سے انسان نہیں بدل جاتے، اگر انسانی ذہن نظام پیداوار کا تابع ہوتا اور اسی کے مطابق خیالات پیدا ہوا کرتے تو اشتراکی حکومت میں ظلم اور استحصال کی ذہنیت بھی یقینی طور پر پیدا نہیں ہونی چاہئے تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے خلاف دورِ جدید کا پورا استدلال ایک قسم کا علمی سفسطہ (Scientific Sophism) ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں، اس نام نہاد علمی استدلال کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا'' یہ صحیح ہے کہ واقعات کے مطالعہ کے لئے ''علمی طریقہ'' اختیار کیا جاتا ہے، مگر علمی طریقہ محض ایک طریقہ ہونے کی وجہ سے صحیح نتائج تک نہیں پہونچا سکتا، اسی کے ساتھ دوسرے ضروری پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے، مثلاً ادھوری اور یک رخی معلومات پر اگر علمی طریقہ کو آزمایا جائے تو وہ بظاہر علمی ہونے کے باوجود ناقص اور غلط نتیجے ہی تک پہنچائے گا۔

جنوری 1964ء کے پہلے ہفتہ میں نئی دہلی میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگریس ہوئی، جس میں بارہ سو علمائے مشرقیات شریک ہوئے، اس موقع پر ایک صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس میں کئی مسلم یادگاروں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی بنوائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ہندو راجاؤں کی بنوائی ہوئی ہیں، مثلاً قطب مینار جو قطب الدین ایبک کی طرف منسوب ہے، وہ دراصل وشنودھوج ہے، جس کو اب سے 23 سو سال پہلے سمندر گپت نے بنوایا تھا، بعد کے مسلم مورخین نے اس کو غلط طور پر قطب مینار کے نام سے

---

(۱) اکتوبر 1964ء میں خروشچیف کی برطرفی اور اس کے بعد کے واقعات سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔

پیش کیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جو بہت پرانے ہیں، اور قطب الدین ایبک سے بہت پہلے تراشے گئے تھے۔

بظاہر یہ ایک علمی استدلال ہے، کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے کچھ پتھر موجود ہیں، مگر قطب مینار کے مطالعہ کے لئے صرف اس کے پرانے پتھروں کا حوالہ دینے سے علمی استدلال کا حق ادا نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ اور بہت سے پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ توجیہہ قطب مینار پر پوری طرح چسپاں نہیں ہوتی، اس کے بجائے یہ دوسری توجیہہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ اس کے پرانے پتھر دراصل پرانی عمارتوں کے کھنڈر سے حاصل کئے گئے جس طرح دوسری قدیم سنگی عمارتوں میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، پھر جب اس دوسری توجیہہ کو قطب مینار کی ساخت، اس کے نقشۂ تعمیر، پرانے پتھروں کا اندازِ نصب، مینار کے ساتھ ناتمام مسجد اور جوابی مینار کے بقیہ آثار نیز تاریخی شہادتوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہی دوسری توجیہہ صحیح ہے، اور پہلی توجیہہ ایک مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

مخالفین مذہب کا مقدمہ بھی بالکل ایسا ہی ہے، جس طرح مذکورہ بالا مثال میں چند پتھروں کو ایک خاص رنگ دے کر سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی استدلال حاصل ہو گیا، اسی طرح چند جزئی اور اکثر اوقات غیر متعلق واقعات کو ناقص رخ سے پیش کر کے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی طریق مطالعہ نے مذہب کی تردید کر دی، حالانکہ واقعہ کے تمام اجزاء کو صحیح رخ سے دیکھا جائے تو بالکل دوسرا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی صداقت کا یہ بذاتِ خود ایک کافی ثبوت ہے کہ اس کو چھوڑنے کے بعد بہترین ذہن بھی الل ٹپ باتیں کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد آدمی کے پاس مسائل پر غور و فکر کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی، مخالفینِ مذہب کی فہرست میں جو نام ہیں، وہ اکثر نہایت ذہین اور ذی علم افراد ہیں، بہترین دماغ، وقت کے بہترین علوم سے

آراستہ ہوکر اس میدان میں اترے ہیں، مگر ان اہل دماغ نے ایسی ایسی مہمل باتیں لکھی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو لکھتے وقت آخر ان کا دماغ کہاں چلا گیا تھا، یہ سارا لٹریچر بے یقینی، تضاد، اعتراف ناواقفیت اور الل ٹپ استدلال سے بھرا ہوا ہے، کھلی ہوئی حقیقتوں کو نظرانداز کرنا اور معمولی تنکے کے سہارے دعاوی کے پل کھڑے کرنا، یہ ان کا کل کارنامہ ہے، صورتِ حال بلاشبہ اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ ان حضرات کا مقدمہ صحیح نہیں، کیونکہ بیان اور استدلال کی یہ خرابیاں صرف غلط مقدمہ کی خصوصیت ہیں، صحیح مقدمے میں کبھی یہ چیزیں پائی نہیں جا سکتی۔

مذہب کی صداقت اور مخالفین مذہب کے نظریے کی غلطی اس سے بھی واضح ہے کہ مذہب کو مان کر زندگی اور کائنات کا جو نقشہ بنتا ہے، وہ ایک نہایت حسین وجمیل نقشہ ہے، وہ انسان کے اعلیٰ افکار سے اسی طرح مطابق ہے، جیسے مادی کائنات ریاضیاتی معیاروں کے عین مطابق ہے، اس کے برعکس مخالفِ مذہب فلسفہ کے تحت جو نقشہ بنتا ہے، وہ انسانی ذہن سے بالکل غیر متعلق ہے، یہاں میں برٹرینڈ رسل کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

> ''انسان ایسے اسباب کی پیداوار ہے، جن کا پہلے سے سوچا سمجھا کوئی مقصد نہیں، اس کا آغاز، اس کی نشوونما، اس کی تمنائیں اور اس کے اس کے اندیشے، اس کی محبت اور اس کے عقائد، سب محض ایٹموں کی اتفاقی ترتیب کا نتیجہ ہیں، اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے، اور اس کے بعد کوئی چیز بھی اسے زندگی عطا نہیں کرسکتی، قرنہا قرن کی جدوجہد، تمام قربانیاں، بہترین احساسات اور عبقریت کے روشن کارنامے سب نظامِ شمسی کے خاتمہ کے ساتھ فنا ہوجانے والی چیزیں ہیں، انسانی کامرانیوں کا پورا محل ناگزیر طور پر کائنات کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جائے گا، یہ باتیں اگر بالکل قطعی نہیں وہ تو حقیقت سے اتنی قریب (So Nearly Certain) ہیں کہ جو فلسفہ بھی اس کا انکار کرے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا۔''(۱)

---

(۱) Limitations of Science , P133

یہ اقتباس گویا غیر مذہبی مادی فکر کا خلاصہ ہے، اس کے مطابق ساری زندگی نہ صرف یہ کہ بالکل تیرہ وتار نظر آتی ہے، بلکہ اگر زندگی کی مادی تعبیر کو لیا جائے تو پھر خیر وشر کا کوئی قطعی معیار باقی نہیں رہتا، اس کی رو سے انسانوں پر بم گرانا کوئی ظالمانہ فعل نہیں، کیونکہ انسانوں کو بہر حال ایک دن مرنا ہے، اس کے برعکس مذہبی فکر میں امید کی روشنی ہے، اس میں زندگی اور موت دونوں بامعنی نظر آنے لگتے ہیں، اس میں ہماری نفسیات کے تمام تقاضے اپنی جگہ پالیتے ہیں، ایک تصور کے ریاضیاتی ڈھانچے فٹ ہوجانے کے بعد اگر سائنسداں مطمئن ہوجاتا ہے، کہ اس نے حقیقت پالی تو مذہبی تصور کا انسانی ذہن میں پوری طرح بیٹھ جانا یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو انسان کی فطرت تلاش کررہی تھی، اس کے بعد ہمارے پاس اس کے انکار کے لئے کوئی واقعی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

یہاں میں ایک امریکی ریاضی داں (Erl Chester Rex) کے الفاظ نقل کروں گا۔ ''میں سائنس کے اس تسلیم شدہ اصول کو استعمال کرتا ہوں جو زیادہ مختلف نظریوں میں سے کسی ایک انتخاب کرنے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے، اس اصول کے مطابق اس نظریے کو اختیار کرلیا جاتا ہے، جو مقابلتاً نہایت سادگی کے ساتھ تمام متنازعہ فیہ مسائل کی تشریح کردے، بہت عرصہ ہوا جب یہی اصول ٹولومی کے نظریے (Ptolemaic Theory) اور کوپرنیکس کے نظریے کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا، اول الذکر کا دعویٰ تھا کہ زمین نظامِ شمسی کا مرکز ہے، اسکے برعکس ثانی الذکر کہتا تھا کہ سورج نظامِ شمسی کا مرکز ہے، ٹولومیہ کا نظریہ اس قدر پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا کہ زمین کی مرکزیت کا نظریہ رد کردیا گیا۔''(۱)

مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ استدلال بہت سے لوگوں کے لئے کافی نہیں ہوگا، ان کے مادی ذہن کے چوکھٹے میں کسی طرح خدا اور مذہب کی بات نہیں بیٹھے گی، مگر جو چیز مجھے مطمئن

(۱) The Evidence of God,P.179

کرتی ہے، وہ یہ کہ ان حضرات کا عدمِ اطمینان حقیقتاً مذہب کے حق میں استدلال کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ ان کا وہ متعصّبانہ ذہن ہے جو مذہبی استدلال کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، جیمز جنیز نے اپنی کتاب ''پراسرار کائنات'' کے آخر میں نہایت صحیح لکھا ہے کہ:

> ''ہمارے جدید ذہن واقعات کی مادی توجیہہ کے حق میں ایک طرح کا تعصب Bias رکھتے ہیں۔''(۱)

وھٹکر چیمبرز (Whittaker Chambers) نے اپنی کتاب شہادت (Witness) میں اپنے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو بلاشبہ اس کی زندگی کے لئے ایک نقطۂ انقلاب Turning Point بن سکتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر بچی کے کان پر جا پڑی اور غیر شعوری طور پر وہ اس کی ساخت کی طرف متوجہ ہو گیا، اس نے اپنے جی میں سوچا۔ ''یہ کتنی غیر ممکن بات ہے کہ ایسی پیچیدہ اور نازک چیز محض اتفاق سے وجود میں آجائے، یقیناً یہ پہلے سے سوچے سمجھے نقشے کے تحت ہی ممکن ہوئی ہوگی'' مگر اس نے جلد ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا، کیونکہ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اس کو ایک منصوبہ مان لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے منصوبہ ساز (خدا) کو بھی ماننا ہوگا، اور یہ ایک ایسا تصور تھا، جسے قبول کرنے کے لئے اس کا ذہن آمادہ نہیں تھا۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ٹامس ڈیوڈ پارکس (Thomas Daved parks) لکھتا ہے۔

> ''میں اپنے پروفیسروں اور ریسرچ کے سلسلے میں اپنے رفقاء کار میں بہت سے سائنسدان کے بارے میں جانتا ہوں کہ علم کیمیا اور طبیعیات کے مطالعہ و تجربہ کے دوران میں انھیں بھی متعدد مرتبہ اس طرح کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا۔''

---

(۱) My sterious Universe, P,189

The Evidence of God in an Expanding Universe .
Edited by john Clover Monsma

New York ,1958, 1958, P.73.74

نظریۂ ارتقاء کی صداقت پر موجودہ زمانے کے ''سائنسداں'' متفق ہو چکے ہیں، ارتقاء کا تصور ایک طرف تمام علمی شعبوں پر چھاتا جارہا ہے، ہر وہ مسئلہ جس کو سمجھنے کے لئے خدا کی ضرورت تھی، اس کی جگہ بے تکلف ارتقا کا ایک خوبصورت بت بنا کر رکھ دیا گیا ہے، مگر دوسری طرف عضویاتی ارتقا (Organic Evolution) کا نظریہ، جس سے تمام ارتقائی تصورات اخذ کئے گئے ہیں، اب تک بے دلیل ہے، حتیٰ کہ بعض علماء نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس تصور کو ہم صرف اس لئے مانتے ہیں کہ اس کا کوئی بدل ہمارے پاس موجود نہیں ہے، سر آرتھر کیتھ (Keith) نے 1953ء میں کہا تھا۔

" Evolution is unproved and unprovable. we believe it only because the only alternative is special creation and that is unthinkable."

Islamic Thouht, Dec. 1961

یعنی ارتقاء ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے، اور وہ ثابت بھی نہیں کیا جاسکتا، ہم اس پر صرف اس لئے یقین کرتے ہیں کہ اس کا واحد بدل تخلیق کا عقیدہ ہے جو سائنسی طور پر نا قابلِ فہم ہے، گویا سائنسدان ارتقاء کے نظریے کے صداقت پر صرف اس لئے متفق ہو گئے ہیں کہ اگر وہ چھوڑ دیں تو لازمی طور پر انھیں خدا کے تصور پر ایمان لانا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ مادی طرز تعبیر کے حق میں اس قسم کے تعصّبات رکھتے ہوں، وہ انتہائی کھلے ہوئے واقعات سے بھی کوئی سبق نہیں لے سکتے تھے، اور مجھے اعتراف ہے کہ ایسے لوگوں کو مطمئن کرنا میرے بس سے باہر ہے۔

اس تعصب کی بھی ایک خاص وجہ ہے ، یہاں میں ایک امریکی عالم طبیعیات (George Herbert Bloun) کے الفاظ نقل کروں گا۔

’’خدا پرستی کی معقولیت اورانکار خدا کا پھسپھساپن بجائے خود ایک آدمی کے لئے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتا، لوگوں کے دل میں یہ شبہ چھپا ہوا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ علما جو ذہنی آزادی (Intellectual Liberty) کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں، آزادی کی محدودیت کا کوئی تصور ان کے لئے وحشتناک ہے۔‘‘

The evidence of God, P.130

چنانچہ جولین ہکسلے نے نبوت کے تصور کو ’’ناقابل برداشت اظہار برتری‘‘ قرار دیا ہے، کیونکہ کسی کو نبی ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یہ حیثیت دی جائے کہ اس کی بات خدا کی بات ہے، اور اس کو حق ہے کہ وہ جو کچھ کہے تمام لوگ اس کو قبول کر لیں، لیکن جب انسان کی حیثیت یہی ہے کہ وہ خالق نہیں مخلوق ہے، وہ خدا نہیں بلکہ خدا کا بندہ ہے، تو اس صورت واقعہ کو کسی خودساختہ تصور کی بنا پر ختم نہیں کیا جا سکتا، ہم حقیقت کو بدل نہیں سکتے، ہم صرف اس کا اعتراف کر سکتے ہیں، اب اگر شتر مرغ کا انجام ہم اپنے لئے پسند نہیں کرتے تو ہماری بہترین عقلمندی یہ ہے کہ جو کچھ ہے، اسے مان لیں، نہ یہ کہ جو کچھ ہے، اس کا انکار کر دیں، حقیقت کا انکار کر کے آدمی صرف اپنا نقصان کرتا ہے، وہ حقیقت کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

استدلال کا طریقہ

مذہب کے خلاف دورِجدید کا جو مقدمہ ہے، وہ اصلاً طریقِ استدلال کا مقدمہ ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کی ترقی نے حقیقت کے مطالعہ کا جو اعلیٰ اور ارتقاء یافتہ طریقہ معلوم کیا ہے، مذہب کے دعوے اور عقیدے اس پر پورے نہیں اترتے، یہ جدید طریقۂ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ حقائق کو معلوم کرنے کا طریقہ ہے، اب چونکہ مذہب کے عقائد ماورائے احساس دنیا سے متعلق ہونے کی وجہ سے تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آسکتے، ان کا استدلال تمام تر قیاس اور استقراء پر مبنی ہے، اس لئے وہ غیر حقیقی ہیں، [1] ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

مگر یہ مقدمہ بجائے خود صحیح نہیں، جدید طریقۂ مطالعہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف وہی چیز اپنا حقیقی وجود رکھتی ہے، جو براہ راست ہمارے تجربے میں آئی ہو، بلکہ براہِ راست تجربے میں آنے والی چیزوں کی بنیاد پر جو علمی قیاس کیا جاتا ہے، وہ بھی اسی طرح حقیقت ہوسکتا ہے، جیسے کوئی تجربہ۔ نہ تجربہ محض تجربہ ہونے کی بنا پر صحیح ہے، اور نہ قیاس محض قیاس ہونے کی بنا پر غلط، ہر ایک میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔

پہلے زمانے میں سمندری جہاز لکڑی کے بنائے جاتے تھے، کیونکہ تصور یہ تھا، پانی

---

(۱) مثلاً خدا کے اثبات کے لئے ہم یہ نہیں کرتے کہ خود خدا کو کسی دوربین کے ذریعہ سے دکھا دیں، بلکہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ کائنات کا نظم اور اس کی معنویت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی خدائی ذہن موجود ہے، اس طرح ہماری دلیل براہِ راست خدا کو ثابت نہیں کرتی بلکہ ایک ایسے قرینہ کو ثابت کرتی ہے، جس کے منطقی نتیجہ کے طور پر خدا کو ماننا پڑے۔

پر وہی چیز تیر سکتی ہے، جو وزن میں پانی سے ہلکی ہو، جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ لوہے کے جہاز بھی پانی پر اسی طرح تیر سکتے ہیں، جس طرح لکڑی کے جہاز سطح بحر پر چلتے ہیں تو اس بنا پر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا گیا کہ لوہا وزنی ہونے کی وجہ سے پانی کی سطح پر تیر ہی نہیں سکتا، کسی لوہار نے اس دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لئے پانی کے ٹب میں لوہے کا نعل ڈال کر دکھادیا کہ وہ پانی کی سطح پر تیرنے کے بجائے ٹب کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے، بظاہر یہ ایک تجربہ تھا، مگر یہ تجربہ صحیح نہیں تھا، کیونکہ اس نے اگر پانی میں لوہے کا تسلہ ڈالا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ دعویٰ کرنے والے کا دعویٰ صحیح ہے۔

اسی طرح ابتداء میں جب کم طاقت کی دوربینوں سے آسمان کا مشاہدہ کیا گیا تو بہت سے ایسے اجسام مشاہدے میں آئے جو پھیلے ہوئے نور کی مانند دکھائی دے رہے تھے، اس مشاہدہ کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ یہ گیسی بادل ہیں، جو ستارے بننے سے پہلے مرحلے سے گزر رہے ہیں، مگر جب مزید طاقت کی دوربینیں تیار ہوئیں اور ان کے ذریعہ ازسرِ نو ان اجسام کو دیکھا گیا تو نظر آیا کہ جو چیز پہلے نورانی بادل کی شکل میں دکھائی دیتی تھی، وہ دراصل بے شمار ستاروں کا مجموعہ تھا، جو غیر معمولی دوری کی وجہ سے بادل کی مانند نظر آرہا تھا۔

معلوم ہوا کہ مشاہدہ اور تجربہ نہ صرف یہ کہ بذاتِ خود علم کے قطعی ذرائع نہیں ہیں، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ علم صرف ان چیزوں کا نام نہیں ہے جو براہِ راست ہمارے مشاہدہ وتجربہ میں آتی ہوں، دورجدید نے بیشک بہت سے آلات اور ذرائع دریافت کر لئے ہیں، جن سے وسیع پیمانے پر تجربہ ومشاہدہ کیا جاسکتا ہے، مگر یہ آلات وذرائع جن چیزوں کا ہمیں تجربہ کراتے ہیں، وہ صرف کچھ اوپری اور نسبتاً غیر اہم چیزیں ہوتی ہیں ، اس کے بعد ان مشاہدات وتجربات کی بنیاد پر جو نظریات قائم کئے جاتے ہیں، وہ سب کے سب غیر مرئی ہوتے ہیں ،نظریات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری سائنس کچھ مشاہدات کی توجیہہ کا نام ہے، یعنی خود نظریات وہ چیزیں نہیں ہیں، جو ہمارے مشاہدہ یا تجربے میں آئے

ہوں، بلکہ کچھ تجربات ومشاہدات نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا ہے کہ یہاں فلاں حقیقت موجود ہے، اگرچہ وہ خود مشاہدہ میں نہیں آئی، کوئی سائنس داں یا مادہ پرست فورس، انرجی، نیچر، قانونِ فطرت، وغیرہ الفاظ استعمال کئے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتا، مگر کوئی بھی سائنس داں نہیں جانتا کہ قوت یا نیچر کیا ہے، سواس کے معلوم واقعات وظواہر کی نامعلوم اور ناقابلِ مشاہدہ علّت کے لئے چند تعبیری الفاظ وضع کر لئے گئے ہیں، جن کی حقیقت معنوی کی تشریح سے ایک سائنس داں بھی اسی طرح عاجز ہے، جس طرح اہلِ مذاہب خدا کی شرح وتوصیف سے، دونوں اپنی جگہ ایک نامعلوم علت کائنات پر غیبی اعتقاد رکھتے ہیں، ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں۔

''ریاضیاتی کائنات قیاسات اور مفروضات کا ایک شاندار جال ہے، جس میں علامتوں کی مساوات (Equation of Symbols) پر مشتمل ناقابلِ بیان مجردات (Abstractions) کے سوا اور کچھ نہیں۔''

Man the unknown, p. 15

سائنس ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتی اور نہیں کرسکتی کہ حقیقت صرف اسی قدر ہے، جو حواس کے ذریعہ بلا واسطہ ہمارے تجربہ میں آئی ہو، یہ واقعہ کہ پانی ایک رقیق اور سیال چیز ہے، اس کو ہم براہ راست اپنی آنکھوں کے ذریعہ دیکھ لیتے ہیں، مگر یہ واقعہ کہ پانی کا ہر مالے کیول ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کے ایک ایٹم پر مشتمل ہے، یہ ہم کو آنکھ سے یا کسی خوردبین سے نظر نہیں آتا، بلکہ صرف منطقی استنباط کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اور سائنس ان دونوں واقعات کی موجودگی یکساں طور پر تسلیم کرتی ہے، اس کے نزدیک جس طرح وہ عام پانی ایک حقیقت ہے، جو مشاہدہ میں نظر آرہا ہے، اسی طرح وہ تجزیاتی پانی بھی ایک حقیقت ہے، جو قطعًا ناقابل مشاہدہ ہے، اور صرف قیاس کے ذریعہ معلوم کیا گیا ہے، یہی حال دوسرے تمام حقائق کا ہے، اے۔ ای مینڈر A.E.Mander لکھتا ہے

''جو حقیقتیں ہم کو براہ راست حواس کے ذریعہ معلوم ہوں، وہ محسوس حقائق (Perceived Facts) ہیں، مگر جن حقیقتوں کو ہم جان سکتے ہیں، وہ صرف انھیں محسوس حقائق تک محدود نہیں ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے حقیقتیں ہیں جن کا علم اگرچہ براہِ راست ہم حاصل نہیں کر سکتے، پھر بھی ہم ان کے بارے میں جان سکتے ہیں، اس علم کا ذریعہ استنباط ہے، اس طرح جو حقیقتیں معلوم ہوں، ان کو استنباطی حقائق (Interred Facts) کہا جا سکتا ہے، یہاں یہ بات اہمیت کے ساتھ سمجھ لینے کی ہے کہ دونوں میں اصل فرق ان کے حقیقت ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ ایک صورت میں ہم ''اس کو'' جانتے ہیں، اور دوسری صورت میں ''اس کے بارے میں'' معلوم کرتے ہیں، حقیقت بہرحال حقیقت ہے، خواہ ہم اسکو براہ راست مشاہدہ سے جانیں یا بہ طریق استنباط معلوم کریں۔''

وہ مزید لکھتا ہے:

''کائنات میں جو حقیقتیں ہیں، ان میں سے نسبتاً تھوڑی تعداد کو ہم حواس کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں، پھر ان کے علاوہ جو اور چیزیں ہیں، ان کو ہم کیسے جانیں، اس کا ذریعہ استنتاج (inference) یا تعقل (Reasoning) ہے۔ استنتاج یا تعقل ایک طریق فکر ہے، جس کے ذریعہ سے ہم کچھ معلوم واقعات سے آغاز کر کے بالآخر یہ عقیدہ بتاتے ہیں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے اگرچہ وہ کبھی دیکھی نہیں گئی۔''

(ایضاً صفحہ 49)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقلی اور منطقی طریقہ حقیقت کو معلوم کرنے کا ذریعہ کیوں کر ہے، جس چیز کو ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی اس کے وجود کا تجزیہ کیا، اس کے متعلق محض عقلی تقاضے کی بنا پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقت ہے، مینڈر کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے:

" The resoning process is valid because
the universe of fact is rational."

یعنی منطقی استخراج کے ذریعہ حقیقت کومعلوم کرنے کا طریقہ صحیح ہے کیونکہ کائنات میں خود منطقیت ہے عالم واقعات ایک ہم آہنگ کل ہے، کائنات کے تمام حقائق ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں، اوران کے درمیان زبردست نظم اور باقاعدگی پائی جاتی ہے، اس لئے مطالعہ کا کوئی ایسا طریقہ جوواقعات کی ہم آہنگی اوران کی موزونیت کوہم پرواضح نہ کرے، صحیح نہیں ہوسکتا، مینڈریہ بتاتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''نظر آنے والے واقعات محض عالمِ حقیقت کے کچھ اجزاء(Pathes of Fact) ہیں، وہ سب کچھ جن کوہم حواس کے ذریعہ جانتے ہیں، وہ محض جزوی اورغیر مربوط واقعات ہوتے ہیں، اگرالگ سے صرف انھیں کودیکھا جائے تووہ بے معنی معلوم ہوں گے، براہِ راست محسوس ہونے والے واقعات کے ساتھ اور بہت سے غیرمحسوس واقعات کوملاکر جب ہم دیکھتے ہیں، اس وقت ہم ان کی معنویت کوسمجھتے ہیں۔''

اس کے بعدوہ ایک سادہ سی مثال سے اس حقیقت کوسمجھاتا ہے:

''ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چڑیا مرتی ہے توزمین پرگرپڑتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پتھرکوزمین سے اٹھانے کے لئے طاقت خرچ کرنی ہوتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ چاندآسمان میں گھوم رہاہے، ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑی سے اترنے کے مقابلے میں چڑھنازیادہ مشکل ہے، اس طرح کے ہزاروں مشاہدات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے درمیان بظاہرکوئی تعلق نہیں، اس کے بعدایک استنباطی حقیقت inferred Facts انکشاف ہوتاہے_____ یعنی تجاذب(Gravitation) کاقانون، اس کے فوراً بعدہمارے یہ تمام مشاہدات اس استنباطی حقیقت کے ساتھ مل کرباہم مربوط ہوجاتے ہیں، اوراس طرح بالکل پہلی بارہمیں معلوم ہوتاہے کہ ان مختلف واقعات کے درمیان نظم باقاعدگی اورموافقت ہے، محسوس واقعات کواگرالگ سے دیکھا جائے تووہ بے ترتیب، غیرمربوط اورمتفرق معلوم ہوں گے، مگرمحسوس واقعات اوراستنباطی حقائق دونوں کوملادیاجائے تووہ ایک منظم شکل اختیارکرلیتے ہیں۔''(صفحہ 51)

اس مثال میں تجاذب کا قانون ایک تسلیم شدہ سائنسی حقیقت ہونے کے باوجود بذاتِ خود قطعاً نا قابل مشاہدہ ہے، سائنس دانوں نے جس چیز کو دیکھا یا تجربہ کیا وہ خود قانونِ کشش نہیں، کچھ دوسری چیزیں ہیں، اوران دوسری چیزوں کو منطقی توجیہہ کے طور پر وہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود ہے، جس کو ہم قانونِ تجاذب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ قانون تجاذب آج ایک مشہور ترین سائنسی حقیقت کے طور پر ساری دنیا میں جانا جاتا ہے، اس کو پہلی بار نیوٹن نے دریافت کیا، مگر خالص تجربی نقطۂ نظر سے اس کی حقیقت کیا ہے، اس کو نیوٹن کی زبان سے سنئے، اس نے بنٹلی کو ایک خط لکھا تھا، جو اس کے مجموعے میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:۔

''یہ نا قابل فہم ہے کہ بے جان اور بے حس مادہ کسی درمیانی واسطہ کے بغیر دوسرے مادہ پر اثر ڈالتا ہے، حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

Works of W. Bently III, P.221

ایک ایسی نا قابل مشاہدہ اور نا قابل فہم چیز کو آج بلا اختلاف سائنسی حقائق سمجھا جاتا ہے، کیوں، صرف اس لئے کہ اگر ہم ان کو مان لیں تو ہمارے کچھ مشاہدات کی اس سے توجیہہ ہو جاتی، گویا کسی چیز کے حقیقت ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ براہِ راست ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آرہی ہو، بلکہ وہ غیر مرئی عقیدہ بھی اسی درجہ کی ایک حقیقت ہے، جس سے ہم مختلف مشاہدات کو اپنے ذہن میں مربوط کر سکتے ہوں، جو معلوم واقعات کی معنویت ہم پر واضح کر سکے، مینڈر لکھتا ہے۔

''یہ کہنا کہ ہم نے ایک حقیقت کو معلوم کر لیا ہے، دوسرے لفظوں میں گویا یہ کہنا ہے کہ ہم نے اس کی معنویت (Meaning) کو معلوم کر لیا ہے، یا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم کسی چیز کی موجودگی کے سبب اور اس کے حالات کو معلوم کر کے اس

کی تشریح کرتے ہیں، ہماری بیشتر یقینیات (Beliefs) اسی نوعیت کی ہیں، وہ
دراصل مشاہدات کی توضیح (Statements of Observation) ہیں۔"

اس بحث کے بعد مینڈر مشہور حقائق (Observed Fact) کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جب ہم کسی مشاہدے (Observation) کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیشہ ہم
مجرد حسّیاتی مشاہدے سے کچھ زیادہ مراد لیتے ہیں، اس سے مراد حسّیاتی مشاہدہ
نیز معرفت (Recognition) ہوتا ہے، جس میں تعبیر کا جز بھی شامل ہو۔" P.56

یہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر عضویاتی ارتقا Organic Evolution کے حقیقت ہونے پر سائنس دانوں کا اجماع ہو گیا ہے، مینڈر کے نزدیک یہ نظریہ "اب اتنے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کو تقریباً حقیقت (Approximate Certainty) کہا جا سکتا ہے"[۱] سمپسن G.G. Simpson کے الفاظ میں نظریہ ارتقاء آخری اور مکمل طور پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے نہ کہ محض ایک قیاس یا متبادل مفروضہ جو سائنسی تحقیق کے کے لئے قائم کر لیا گیا ہو" [۲] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1958ء) کے مقالہ نگار نے حیوانات میں ارتقاء کو بطور ایک حقیقت (Truth) تسلیم کیا ہے، اور کہا ہے کہ ڈارون کے بعد اس نظریے کو سائنس دانوں اور تعلیم یافتہ طبقے کا قبول عام (General Acceptance) حاصل ہو چکا ہے (R.S.Lull) لکھتا ہے:

"ڈارون کے بعد نظریہ ارتقاء دن بدن زیادہ قبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے،
یہاں تک کہ اب سوچنے اور جاننے والے لوگوں میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ
گیا ہے کہ یہ واحد منطقی طریقہ ہے، جس کے تحت عمل تخلیق کی توجیہ ہو سکتی ہے، اور اس

---

(۱) Clearer Thinking, P 113

(۲) Meaning of Evolution, P. 127

کو سمجھا جا سکتا ہے۔''

Oraganic Evolution, P.15

یہ نظریہ جس کی صداقت پر سائنس دانوں کا اس قدر اتفاق ہو گیا ہے، کیا اسے کسی نے دیکھا ہے، یا اس کا تجربہ کیا ہے ــــــــ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ ایسا ہو سکتا، ارتقاء کا مزعومہ عمل اتنا پیچیدہ ہے، اور اتنے بعید ترین ماضی سے متعلق ہے، جس کو دیکھنے یا تجربہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لل کے مذکورہ بالا الفاظ کے مطابق یہ صرف ایک ''منطقی طریقہ'' ہے جس سے تخلیقی مظاہر کی توجیہہ کی جاتی ہے نہ کہ واقعہ مشاہدہ، چنانچہ سر آرتھر کیتھ جو خود بھی ارتقاء کا حامی ہے، اس نے ارتقاء کو مشاہداتی یا تجرباتی حقیقت کے بجائے ایک ''عقیدہ'' قرار دیا ہے، اس کے الفاظ ہیں،

''Evolution is a basic dogma of rationalism,"

Revolt Against Reason, P.112

یعنی نظریۂ ارتقاء مذہب عقلیت کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، چنانچہ ایک سائنسی انسائیکلو پیڈیا میں ڈارونزم کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے، جس کی بنیاد توجیہہ بلا مشاہدہ Explannation Without Demonstration پر قائم ہے۔ (۱)

پھر ایک ایسی غیر مشاہد اور نا قابل تجربہ چیز کو علمی حقیقت کیوں سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ اے، ای ہینڈر کے الفاظ میں یہ ہے:

1۔ یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ (Consistent) ہے۔

2۔ اس نظریے میں ان بہت سے واقعات کی توجیہہ مل جاتی ہے، جو اس کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔

3۔ دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔ (صفحہ 112)

---

(۱) Revolt Against Reason, P.III

اگر یہ استدلال نظریہ ارتقاء کو حقیقت قرار دینے کے لئے کافی ہے تو یہی استدلال بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے ـــــــــ ایسی حالت میں نظریۂ ارتقاء کو سائنسی حقیقت قرار دینا اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لئے نا قابل قبول ٹھہرانا صرف اس بات کا مظاہرہ ہے کہ آپ کا مقدمہ اصلاً ''طریق استدلال'' کا مقدمہ نہیں ہے، بلکہ وہ نتیجہ سے متعلق ہے، ایک ہی طریق استدلال سے اگر کوئی خالص طبیعیاتی نوعیت کا واقعہ ثابت ہو تو آپ فوراً اسے قبول کرلیں گے اور اگر کوئی الٰہیاتی نوعیت کی چیز ثابت ہو تو آپ اسے رد کردیں گے، کیوں کہ یہ نتیجہ آپ کو پسند نہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہب ایمان بالغیب کا نام ہے، اور سائنس ایمان بالشہود کا، حقیقت یہ ہے مذہب اور سائنس دونوں ہی ایمان بالغیب پر عمل کرتے ہیں، مذہب کا اصل دائرہ اشیاء کی اصلی اور آخری حقیقت متعین کرنے کا دائرہ ہے، سائنس اسی وقت تک مشاہداتی علم ہے، جب تک وہ ابتدائی اور خارجی مظاہر پر کلام کر رہی ہو، جہاں وہ اشیاء کی آخری اور حقیقی حیثیت متعین کرنے کے میدان میں آتی ہے، جو کہ مذہب کا اصلی میدان ہے، تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح ''ایمان بالغیب'' کا طریقہ اختیار کرتی ہے، جس کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہے کیونکہ اس میدان میں اس کے سوا چارہ نہیں، بقول آرتھر اڈنگٹن (Sir Arthur Eddington) دور جدید کا سائنس داں جس میز پر کام کر رہا ہے، وہ بیک وقت دو میزیں ہیں، ایک میز تو وہی ہے جو ہمیشہ سے عام انسانوں کی میز رہی ہے، اور جس کو چھونا اور دیکھنا ممکن ہے ـــــــــ دوسری میز اس کی علمی میز (Scientific Table) ہے، اس کا بیشتر حصہ خلا ہے، اور اس میں بے شمار نا قابل مشاہدہ الکٹران دوڑ رہے ہیں، اسی طرح ہر چیز کے مثنّیٰ (Duplicate) ہیں، جن میں سے ایک تو قابل مشاہدہ ہے، اور دوسرا صرف تصوراتی ہے، اسکو کسی بھی خوردبین یا دوربین سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

جہاں تک چیزوں کی شکلِ اول کا تعلق ہے، اس کو بیشک سائنس دیکھتی ہے، اور بہت دور تک دیکھتی ہے، مگر اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے شکل ثانی کو بھی دیکھ لیا ہے، اس میدان میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت کے مظاہر کو دیکھ کر اس کے بارے میں ایک رائے قائم کرتی ہے، گویا جہاں تک اس دوسرے میدان ــــــــ اشیا کی حقیقت معلوم کرنے کا میدان ــــــــ کا تعلق ہے، سائنس نام ہے، معلوم حقائق کی مدد سے نامعلوم حقائق دریافت کرنے کا۔

جب سائنس داں کے پاس مشاہداتی حقائق (جن کو درحقیقت وجدان صورت پذیر کرتا ہے) کی کچھ تعداد فراہم ہوجاتی ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب اسے ایک ایسے مفروضہ یا نظریہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک وجدانی یا اعتقادی تصور کی ضرورت ہے، جو ان مشاہدات کی تشریح کرے، ان کو منظم کرے اور انھیں ایک وحدت میں پرودے، لہٰذا وہ اس قسم کا ایک وجدانی مفروضہ ایجاد کرتا ہے، اگر یہ مفروضہ فی الواقع ان تمام حقائق کی معقول تشریح کر رہا ہو، ایک ایسی ہی قابل یقین حقیقت شمار کیا جاتا ہے، جیسی کہ کوئی اور علمی حقیقت جس کو سائنس داں ''مشاہدہ'' قرار دیتا ہے، اگرچہ یہ حقیقت سائنس دانوں کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کبھی مشاہدہ میں نہ آئی ہو، مگر یہ غیر مرئی حقیقت صرف اس لئے حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ دوسرا مفروضہ ایسا موجود نہیں ہے، جو ان مشہود حقائق کی واقعی تشریح کرتا ہو۔

گویا سائنس داں ایک غائب چیز کی موجودگی پر اس کے نتائج واثرات کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے، ہر وہ حقیقت جس پر یقین کرتے ہیں، شروع میں ایک مفروضہ ہی ہوتی ہے، پھر جوں جوں نئے حقائق منکشف ہو کر اس مفروضے کی تائید کرتے جاتے ہیں، اس مفروضہ کی صداقت نمایاں ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس پر ہمارا یقین، حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے، اگر آشکارہ ہونے والے حقائق اس مفروضہ کی تائید نہ کریں تو ہم اس مفروضہ

کوغلط سمجھ کرترک کردیتے ہیں،اس قسم کونا قابل انکارحقیقت کی ایک مثال جس پرسائنس داں ایمان بالغیب رکھتاہے۔’’ ایٹم‘‘ ہے،ایٹم کوآج تک معروف معنوں میں دیکھانہیں گیا،مگراس کے باوجودوہ جدیدسائنس کی سب سے بڑی تسلیم شدہ حقیقت ہے،اسی بناپرایک عالم نے سائنسی نظریات کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"Theories and mental pictures that explain known law."

نظریات دراصل ذہنی نقشے ہیں، جومعلوم قوانین کی توجیہ کرتے ہیں۔

سائنس کے میدان میں جن’’حقائق‘‘ کومشاہداتی حقائق (observed Facts) کہاجاتاہے، وہ دراصل مشاہداتی حقائق نہیں بلکہ کچھ مشاہدات کی تعبیریں ہیں، اور چونکہ انسانی مشاہدہ کوکامل نہیں کہاجاسکتا،اس لئے یہ تعبیریں بھی تمام کی تمام اضافی ہیں،اورمشاہدہ کی ترقی سے تبدیل ہوسکتی ہیں۔ جے،ڈبلو،سولیون (Sullivan) سائنسی نظریات پرایک تبصرہ کرنے کے بعدلکھتاہے:

’’سائنسی نظریات کےاس جائزے سے یہ ثابت ہوجاتی ہے کہ ایک صحیح سائنسی نظریہ محض یہ معنی رکھتاہے کہ وہ ایک کامیاب عملی مفروضہ Successful Working Hypothesis ہے، یہ بہت ممکن ہے کہ تمام سائنسی نظریات اصلاً غلط ہوں،جن نظریات کوآج ہم تسلیم کرتے ہیں، وہ محض ہمارے موجودہ حدودمشاہدہ کے اعتبارسے حقیقت ہیں، حقیقت (Truth) اب بھی سائنس کی دنیامیں ایک علمی اورافادی مسئلہ(Pragmatic Affair) ہے۔‘‘(۱)

اس کے باوجودسائنس داں ایک مفروضہ کوجواس کے مشاہداتی حقائق کی معقول تشریح کرتاہو،مشاہداتی حقائق سے کم درجہ کی علمی حقیقت نہیں سمجھتا،وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مشاہداتی

---

(۱) The Limitation of Science, P.158

حقائق تو سائنس ہیں، لیکن وہ نظریہ جو ان کی تشریح کرتا ہے وہ سائنس نہیں ـــــــــ اسی کا نام ایمان بالغیب ہے، ایمان بالغیب مشہود حقائق سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، وہ محض ایک اندھا عقیدہ نہیں ہے، بلکہ وہ مشہود کی صحیح ترین توجیہہ ہے، جس طرح نیوٹن کے نظریۂ روشنی (Corpuscular Theory of Light) کو بیسویں صدی کے سائنس دانوں نے اس لئے رد کر دیا کہ وہ مظاہر نور کی تشریح میں ناکام نظر آیا، اسی طرح ہم بے خدا مفکرین کے نظریۂ کائنات کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ وہ حیات وکائنات کے مظاہر کی تشریح میں ناکام ہے، مذہب کے بارے میں ہمارے یقین کا ماخذ عین وہی چیز ہے، جو ایک سائنس داں کے لئے کسی سائنسی نظریے کے بارے میں ہوتا ہے، ہم مشاہداتی حقائق کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ مذہب کی تشریحات عین حق ہیں، اور اس درجہ حق ہیں کہ ہزاروں برس گزرنے کے باوجود ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، ہر وہ انسانی نظریہ جو اَب سے چند سو برس پہلے بنایا گیا، وہ نئے مشاہدات وتجربات کے ظہور میں آنے کے بعد مشتبہ اور مردود ہو چکا ہے، اِسکے برعکس مذہب ایک ایسی صداقت ہے، جو ہر نئی تحقیق سے اور نکھرتی چلی جا رہی ہے، ہر واقعی دریافت اس کے لئے تصدیق بنتی چلی جاتی ہے۔

اگلے صفحات میں ہم اسی پہلو سے مذہب کے بنیادی تصورات کا مطالعہ کریں گے۔

کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے

عرصہ ہوا کہ، کیرالا کے عیسائی مشن نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا، جس کا نام تھا۔

"Nature and Science speak abbout God."

اس باب کے عنوان کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ موزوں ترین ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وہ مخلوق ہے، جو ہمارے سامنے موجود ہے، فطرت اور اس کے بارے میں ہمارا بہترین علم پکار رہا ہے کہ بے شک اس دنیا کا ایک خدا ہے، اس کے بغیر ہم کائنات کو اور اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتے۔

کائنات کی موجودگی، اس کے اندر حیرت انگریز تنظیم اور اس کی اتھاہ معنویت کی اس کی سوا کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی کہ اس کو کسی نے بنایا ہے، اور یہ بنانے والا ایک محدود ذہن ہے، نہ کہ کوئی اندھی طاقت۔

1۔فلسفیوں میں سے ایک گروہ، نہایت مختصر گروہ، ایسا ہے جو کسی قسم کے وجود ہی میں شک کرتا ہے، اس کے نزدیک نہ یہاں کوئی انسان ہے اور نہ کوئی کائنات، بس ایک عدم محض ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں اگر اس نقطۂ نظر کو صحیح مان لیا جائے تو یقیناً خدا کا وجود مشتبہ ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہم کائنات کو مانتے ہیں، ہمارے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں_____ کیونکہ عدم سے وجود کا پیدا ہونا ایک ناقابلِ قیاس بات ہے۔

جہاں تک اس مخصوص قسم کی تشکیک اور لاادریت کا تعلق ہے، وہ ایک فلسفیانہ نکتہ تو ہوسکتا ہے مگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا سوچنا خود اس

بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی وجود ہے، جب راستہ چلتے ہوئے کسی پتھر سے ٹکراتے ہیں، اور ہمیں تکلیف ستانے لگتی ہے تو یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارے باہر کوئی دنیا ہے ،جس کا اپنا وجود ہے، اسی طرح ہمارا ذہن اور ہمارے تمام حواس ہر آن بے شمار چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، اور یہ علم واحساس ہر شخص کے لئے اس بات کا ایک ذاتی ثبوت ہے، کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے، جو واقعی طور پر اپنا وجود رکھتی ہے، اب اگر کسی کا فلسفیانہ تفکر اس کے لئے دنیا کے وجود کو مشتبہ کر دیتا ہے، تو یہ ایک ایسی مستثنیٰ حالت ہے جو کروڑوں انسانوں کے تجربات سے غیر متعلق ہے، ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی مخصوص قسم کی ذہنی فضا میں گم ہو گیا ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا ہے۔

اگر چہ کائنات کا موجود نہ ہونا بذاتِ خود اس بات کا کوئی لازمی ثبوت نہیں ہے کہ خدا بھی موجود نہ ہو، تاہم اپنی انتہائی لغویت کے باوجود یہی ایک نقطۂ نظر ہے، جس کے لئے خدا کا وجود مشتبہ ہو سکتا ہے، مگر یہ نقطۂ نظر خود اتنا بے معنی ہے کہ آج تک نہ تو عام انسانوں کے لئے وہ قابلِ فہم ہو سکا اور نہ علمی دنیا میں اس کو قبول عام حاصل ہوا ہے، عام انسان اور عام اہل علم بہر حال اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک وجود ہے، اور کائنات بھی اپنا وجود رکھتی ہے، سارے علوم اور زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی علم و یقین کی بنیاد پر قائم ہیں۔

پھر جب ایک کائنات ہے تو لازماً اس کا ایک خدا ہونا چاہئے، یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ ہم مخلوق کو مانیں مگر خالق کا وجود تسلیم نہ کریں، ہمیں کسی بھی ایسی چیز کا علم نہیں جو پیدا کئے بغیر وجود میں آ گئی ہو، ہر چھوٹی بڑی چیز لازمی طور اپنا ایک سبب رکھتی ہے پھر اتنی بڑی کائنات کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ یونہی وجود میں آ گئی، اس کا کوئی خالق نہیں۔

جان اسٹوارٹ مل (Stuart Mill) نے اپنی آٹو بیا گریفی میں لکھا ہے کہ میرے

باپ نے مجھے یہ سبق دیا کہ یہ سوال کہ کس نے مجھے پیدا کیا(Who Made Me) خدا کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد فوراً دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیاWho Made God چنانچہ برٹرینڈ رسل نے بھی اسی اعتراض کو تسلیم کرتے محرک اول کے استدلال کو رد کر دیا ہے:۔

The Age of Analysis by Morton White, P.21. 22.

یہ منکرین خدا کا بہت پرانا استدلال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا اگر کوئی خالق مانیں تو اس خالق کو لازمی طور پر ازلی ماننا پڑے گا، پھر جب خدا کو ازلی ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی مان لی جائے اگر چہ یہ بالکل بے معنی بات ہے، کیونکہ کائنات کی کوئی ایسی صفت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے ،جس کی بنا پر اس کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے ______ تاہم انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہر فریبِ حُسن ضرور موجود تھا، مگر اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermo dynamics) کے انکشاف کے بعد تو یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔

یہ قانون جسے ضابطۂ ناکارگی (Law of Entropy) کہا جاتا ہے، ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی ،ضابطۂ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے، مگر اس چکر کو الٹا چلایا نہیں جا سکتا کہ خود بخود یہ حرارت ، کم حرارت کے وجود سے زیادہ حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے، ناکارگی ، دستیاب توانائی(Available Energy) اور غیر دستیاب توانائی (Unavailable Energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے، اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی، اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی، اس کا نتیجہ یہ

نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا خاتمہ ہوجائے گا اور زندگی بھی اسی کے ساتھ ختم ہوجائے گی، لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے ورنہ اخراج حرارت کے لازمی قانون کی وجہ سے اس کی توانائی کبھی ختم ہوتی، اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔

اس جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی عالم حیوانات (Edward Luther Kessel) لکھتا ہے:۔

''اس طرح غیرارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز (Beginning) رکھتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کردیا ہے، کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ اپنے آپ شروع نہیں ہوسکتی، یقیناً وہ ایک محرک اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے۔''

The Evidence of God,P.51

یہی بات سر جیمز نے ان الفاظ میں کہی ہے:

''موجودہ سائنس کا یہ خیال ہے کہ کائنات میں ناکارگی (Entropy) کا عمل ہمیشہ جاری رہے گا یہاں تک کہ اس کی توانائی بالکل ختم ہوجائے، یہ ناکارگی ابھی اپنے درجہ کو نہیں پہنچی ہے، اگر ایسا ہوگیا ہوتا تو ہم اس کے متعلق سوچنے کے لئے موجود نہ ہوتے، یہ ناکارگی اس وقت بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، اور اس بنا پر اس کا ایک آغاز ہونا ضروری ہے، کائنات میں لازماً اس قسم کا کوئی عمل ہوا ہے، جس کو ہم ایک وقت خاص میں تخلیق (Creation at a Time) کہہ سکتے ہیں، نہ یہ کہ وہ لامتناہی مدت سے موجود ہے۔'' P.133,Mystrious Universe

اس طرح کے اور بھی طبیعیاتی شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات ازل سے

موجود نہیں ہے، بلکہ وہ ایک محدود عمر رکھتی ہے، مثلاً فلکیات کا یہ مشاہدہ ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے، تمام کہکشائیں اور فلکیاتی اجسام مشاہدہ میں نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس صورت حال کی اس وقت نہایت عمدہ توجیہہ ہوجاتی ہے، جب ہم ایک ایسے ابتدائی وقت کو تسلیم کرلیں، جب تمام اجزائے ترکیبی مجتمع اور مرکوز حالت میں تھے، اور اس کے بعد ان میں حرکت و توانائی کا آغاز ہوا، اس طرح کے مختلف قرائن کی بناپر عام اندازہ یہ ہے کہ لگ بھگ پچاس کھرب سال پہلے ایک غیر معمولی دھماکے سے یہ سارا عالم وجود میں آیا، اب سائنس کی اس دریافت کو ماننا کہ کائنات محدود عمر رکھتی ہے، اور اسکے موجد کو نہ ماننا، ایسا ہی ہے، جیسے کوئی شخص یہ تو تسلیم کرے کہ تاج محل ہمیشہ سے موجود نہیں تھا، بلکہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں بنا، مگر اس کے باوجود اس کا کوئی معمار اور انجینیر تسلیم نہ کرے اور کہے کہ وہ بس اپنے آپ ایک مخصوص تاریخ کو بن کر کھڑا ہو گیا ہے!

2۔ فلکیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں شاید اسی قدر آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے، ان میں کچھ ستارے ایسے ہیں، جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جاسکتی ہیں، اور بعض ستارے تو اس قدر بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر سماسکتی ہیں، یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی ممکن حد تک تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے پھر اتنی وسعت کے باوجود یہ کائنات ٹھیری ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے، اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر 130 کروڑ سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہوجاتے ہیں، اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی بھی کائنات کا چکر

کبھی پورا نہیں کرسکتا، وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا۔ (۱)

آسمان گرد وغبار سے پاک ہوتو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھ سے دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن معمولی دوربینوں کی مدد سے یہ تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہوجاتی ہے، اور وقت کی سب سے بڑی دوربین جو ماؤنٹ پیلومر پر لگی ہوئی ہے، اس سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں، مگر یہ تعداد اصل تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے، کائنات ایک بے انتہا وسیع خلا ہے، جس میں لاتعداد ستارے غیر معمولی رفتار سے مسلسل حرکت کررہے ہیں، کچھ ستارے تنہا سفر کررہے ہیں، کوئی دو یا زیادہ ستاروں کے مجموعوں کی شکل میں ہیں اور بے شمار ستارے ایسے ہیں، جو مجامع النجوم کی صورت میں متحرک ہیں، روشن دان سے کمرے میں آنے والی روشنی کے اندر آپ نے بے شمار ذرے اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے اسی کو اگر آپ بہت بڑے پیمانے پر قیاس کرسکیں تو کائنات کے اندر ستاروں کی گردش کا آپ ہلکا سا اندازہ کرسکتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ذرے باہم ملے ہوئے حرکت کرتے ہیں، اور ستارے تعداد کی اس کثرت کے باوجود بالکل یکہ وتنہا دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سرگرم سفر ہیں، جیسے وسیع سمندروں میں چند جہاز جو ایک دوسرے سے اتنی دوری پر چل رہے ہوں کہ انھیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔

یہ ساری کائنات ستاروں کے بے شمار جھرمٹوں کی صورت میں ہے، ہر جھرمٹ کو کہکشاں کہتے ہیں، اور یہ سب کے سب مسلسل حرکت میں ہیں، سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہیں، وہ چاند ہے، چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور رہ کر اس کے گرد مسلسل اس طرح گھوم رہا ہے کہ ہر ساڑھے 29 دن میں زمین کے گرد اس کا ایک چکر پورا ہوجاتا ہے، اسی طرح ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے، وہ اپنے

---

(۱) یہ کائنات کی وسعت کے بارے میں آئنسٹائن کا نظریہ ہے، مگر یہ صرف ایک ''ریاضی داں کا قیاس ہے،'' حقیقت یہ ہے کہ انسان ابھی تک کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہوئی سورج کے گرد انیس کروڑ میل کا دائرہ بناتی ہے جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے، اسی طرح زمین سمیت نو سیارے ہیں، اور وہ سب کے سب سورج کے گرد مسلسل دوڑ رہے ہیں، ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب میل کے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے، یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں (Asteroids) کا ایک حلقہ، ہزاروں دم دار ستارے اور لاتعداد شہاب ثاقب ہیں جو اسی طرح گردش میں مصروف ہیں، ان سب کے بیچ میں وہ ستارہ ہے، جس کو ہم سورج کہتے ہیں، اور جس کا قطر آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے، اور وہ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام سیاروں اور سیارچوں کو لئے ہوئے ایک عظیم کہکشانی نظام کے اندر چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہا ہے، اسی طرح ہزاروں حرکت کرتے ہوئے نظام ہیں، جن سے مل کر ایک کہکشاں وجود میں آتی ہے، کہکشاں گویا ایک بہت بڑی پلیٹ ہے، جس پر بے شمار ستارے منفرداً اور مجتمعاً لٹوؤں کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں، پھر یہ کہکشائیں خود بھی حرکت کرتی ہیں، چنانچہ وہ قریبی کہکشاں جس میں ہمارا شمسی نظام واقع ہے، وہ اپنے محور پر اس طرح گردش کر رہی ہے کہ اس کا ایک دور بیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔

علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات پانچ سوملین، (ایک ملین برابر دس لاکھ) کہکشانوں پر مشتمل ہے، اور ہر کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم وبیش ستارے پائے جاتے ہیں، قریبی کہکشاں جس کے ایک حصے کو ہم رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دیکھتے ہیں، اس کا رقبہ ایک لاکھ سال نور ہے، اور ہم زمین کے رہنے والے کہکشاں کے مرکز سے تیس ہزار نوری سال کے بقدر دور ہیں، پھر یہ کہکشاں ایک اور بڑی کہکشاں کا جزو

ہے، جس میں اسی طرح سترہ کہکشائیں حرکت کر رہی ہیں، اور پورے مجموعہ کا قطر بیس لاکھ سال نور ہے۔

ان تمام گردشوں کے ساتھ ایک اور حرکت جاری ہے، اور وہ یہ کہ ساری کائنات غبار کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے ہمارا سورج ہیبت ناک تیزی کے ساتھ چکر کھاتا گھومتا ہوا بارہ میل فی سکنڈ کی رفتار سے اپنی کہکشاں کے بیرونی حاشیے کی طرف مسلسل بھاگ رہا ہے، اور اپنے ساتھ نظام شمسی کے تمام توابع کو بھی لئے جا رہا ہے اسی طرح تمام ستارے اپنی گردش کو قائم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرف کو بھاگ رہے ہیں، کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سکنڈ ہے، کسی کی 33 میل فی سکنڈ کسی کی 84 میل فی سکنڈ، اسی طرح تمام ستارے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ دور بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

یہ ساری حرکت حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہی ہے، نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا اور نہ رفتار میں کوئی فرق پڑتا، زمین کی حرکت سورج کے گرد ہر درجہ منضبط ہے، اسی طرح اپنے محور کے اوپر اس کی گردش اتنی صحیح ہے کہ صدیوں کے اندر بھی اس میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں آنے پاتا، زمین کا سیارہ جس کو چاند کہتے ہیں، اس کی گردش بھی پوری طرح مقرر ہے، اس میں جو تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، وہ بھی ہر ساڑھے 18 سال کے بعد نہایت صحت کے ساتھ دہرادیا جاتا ہے، یہی تمام اجرام سماوی کا حال ہے، حتّٰی کہ ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اکثر خلائی گردش کے دوران ایک پورا کہکشانی نظام، جو اربوں متحرک ستاروں پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرے کہکشانی نظام میں حرکت کرتا ہوا داخل ہوتا ہے اور پھر اس سے نکل جاتا ہے مگر باہم کسی قسم کا کوئی ٹکراو پیدا نہیں ہوتا ـــــــ اس عظیم اور حیرت انگیز تنظیم کو دیکھ کر عقل کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے آپ قائم نہیں ہے بلکہ کوئی غیر معمولی طاقت ہے جس نے اس اتھاہ نظام کو قائم رکھا ہے۔

یہی ضبط و نظم جو بڑی بڑی دنیاؤں کے درمیان نظر آتا ہے، وہی چھوٹی دنیاؤں میں بھی

انتہائی مکمل شکل میں موجود ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے چھوٹی دنیا ایٹم ہے، ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خوردبین سے نظر نہیں آتا، حالانکہ جدید خوردبین کسی چیز کو لاکھوں گنا بڑھا کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے، ایٹم کی حقیقت انسانی قوت بصارت کے اعتبار سے ''لاشئے'' سے زیادہ نہیں، مگر اس انتہائی چھوٹے ذرے کے اندر حیرت انگیز طور پر ہمارے شمسی نظام کی طرح ایک زبردست گردشی نظام موجود ہے، ایٹم برق پاروں کے ایک مجموعے کا نام ہے، مگر یہ برق پارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان ایک طویل خلائی حجم ہوتا ہے، پیسی کا ایک ٹکڑا جس میں ایٹمی ذرات کافی سختی اور مضبوطی کے ساتھ آپس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ برق پارے حجم کے سو کروڑ حصوں میں سے ایک حصہ بھی مشکل سے گھیرتے ہیں، بقیہ حصے بالکل خالی ہوتے ہیں، اگر الکٹرون اور پروٹون کے دو ٹکڑوں کی حیثیت سے تصویر بنائی جائے تو دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً 350 گز ہوسکتا ہے یا ایٹم کا تصور گرد کے ایک غیر مرئی ذرہ کی حیثیت سے کیا جائے تو الکٹرون کی گردسے جو حجم بنتا ہے، اس کی مقدار ایک ایسے فٹ بال کی سی ہوسکتی ہے، جس کا قطر آٹھ فٹ ہو۔

ایٹم کے منفی برق پارے جو الکٹرون کہلاتے ہیں، وہ مثبت برق پارے کے گرد گھومتے ہیں، جن کو پروٹون کہا جاتا ہے، یہ برقیے، جو روشنی کی کرن کے ایک موہوم نقطہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، اپنے مرکز کے گرد اسی طرح گردش کرتے ہیں، جیسے زمین اپنے مدار پر سورج کے گرد گردش کرتی ہے، اور یہ گردش اتنی تیز ہوتی ہے کہ الکٹرون کا کسی ایک جگہ تصور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا وہ پورے مدار پر ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہے، وہ اپنے مدار پر ایک سکنڈ میں ہزاروں ارب چکر لگا لیتا ہے۔

یہ ناقابل قیاس اور ناقابل مشاہدہ تنظیم اگر سائنس کے قیاس میں اس لئے آجاتی ہے کہ اس کے بغیر ایٹم کے عمل کو توجیہہ نہیں کی جاسکتی تو ٹھیک اسی دلیل سے آخر ایک ایسے ناظم

کا تصور کیوں نہیں کیا جاسکتا جس کے بغیر ایٹم کی اس تنظیم کا بر پا ہونا محال ہے۔

ٹیلی فون کی لائن میں تاروں کا پیچیدہ نظام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے ہم کو تعجب ہوتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ لندن سے ملبورن کے لئے ایک کال چند منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے، مگر یہاں ایک اور مواصلاتی نظام ہے، جو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، یہ ہمارا اپنا عصبی نظام (Nervous System) ہے، جو قدرت نے قائم کر رکھا ہے، اس مواصلاتی نظام پر رات دن کروڑوں خبریں اِدھر سے اُدھر دوڑتی رہتی ہیں، جو دل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے، مختلف اعضا کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں، پھیپھڑے سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کرے، اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہوتو ہمارا پورا وجود منتشر چیزوں کا مجموعہ بن جائے جن میں سے ہر ایک الگ الگ اپنے راستے پر چل رہا ہو۔

اس مواصلاتی نظام کا مرکز انسان کا بھیجا ہے، آپ کے بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خانے (Never Cells) ہیں، ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (Never Fibers) کہتے ہیں، ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر (70) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے، انھیں اعصاب کے ذریعہ ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور سارا عمل کرتے ہیں، زبان میں تین ہزار ذائقے خانے (Test Buds) ہیں، جن میں ہر ایک اپنے علٰیحدہ عصبی تار کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوا ہے، انھیں کے ذریعہ وہ ہر قسم کے مزوں کو محسوس کرتا ہے، کان میں ایک لاکھ تعداد میں سماعت خانے ہوتے ہیں، انھیں خانوں سے ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ ہمارا دماغ سنتا ہے، ہر آنکھ میں 130 ملین (Light Receptors) ہوتے ہیں جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں، ہماری تمام جلد میں حسیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے، اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً 30 ہزار

’’گرم خانے‘‘ اس کو محسوس کر کے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں، اسی طرح جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں، جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، جب کوئی سرد چیز جسم کو ملتی ہے تو دماغ اس کی خبروں سے بھر جاتا ہے، جسم کانپنے لگتا ہے ،جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں،فوراً مزید خون رگوں میں دوڑ کر آتا ہے تا کہ زیادہ گرمی پہونچائی جاسکے ،اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبرین دماغ کو اطلاع کرتے ہیں، اور تین ملین پسینہ کے غدود (Glands) ایک ٹھنڈا عرق خارج کرنا شروع کرتے ہیں،

عصبی نظام کی کئی تقسیمیں ہیں، ان میں سے ایک (Autonomic Branch) ہے، یہ ایسے افعال انجام دیتی ہے، جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ہضم ، سانس لینا اور دل کی حرکت وغیرہ ، پھر اس عصبی شاخ کے بھی دو حصّے ہیں، ایک کا نام ہے، مشارک نظام (Sympathetic System) جو کہ حرکت پیدا کرتا ہے،اور دوسرا (Parasympathetic) ہے، جو روک کا کام کرتا ہے، اگر جسم تمام تر پہلے کے قابو میں چلا جائے تو ،مثال کے طور پر، دل کی حرکت اتنی تیز ہوجائے کہ موت آجائے ،اور اگر بالکل دوسرے کا اختیار ہوجائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے ،دونوں شاخیں نہایت صحت کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہیں، جب دباؤ کے وقت فوری طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو (Sympathetic) کو غلبہ حاصل ہوجاتا ہے،اور دل اور پھیپھڑے تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں، اسی طرح نیند کے وقت (Parasympathetic) کا غلبہ ہوتا ہے، جب کہ وہ تمام جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کردیتا ہے۔(مزید تفصیل کے لئے ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر 1956ء دیکھئے)

اس طرح کے بے شمار پہلو ہیں، اور اسی طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک زبردست نظام قائم ہے جس کے سامنے انسانی مشینوں کا بہتر سے بہتر نظام بھی مات ہے، اور اب تو قدرت کی نقل سائنس کا ایک مستقل موضوع بن چکا ہے، اس سے پہلے سائنس کا میدان

صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ فطرت میں جو طاقتیں چھپی ہیں، ان کو دریافت کر کے استعمال کیا جائے، مگر اب قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکانکی نقل کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے، اس طرح ایک نیا علم وجود میں آیا، جس کو بایونکس (Bionics) کہتے ہیں، بایونکس، یا حیاتیاتی نظام (Biological Systems) اور طریقوں کا اس غرض سے مطالعہ کرتی ہے کہ جو معلومات حاصل ہوں انھیں انجینئرنگ کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

قدرت کی نقل کرنے کی اس قسم کی مثالیں ٹکنالوجی میں پائی جاتی ہیں، مثلاً کیمرہ دراصل بنیادی طور پر آنکھ کی میکانکی نقل ہے، کیمرے کا لنس (Lens) آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ ہے، ڈائفرام (Diaphragm) پردہ شبکی (Lris) ہے، اور روشنی سے متاثر ہونے والی فلم آنکھ کا پردہ ہے، جس میں عکس دیکھنے کے لئے ڈورے اور مخروطی شکلیں ہوتی ہیں، [۱] ماسکو یونیورسٹی میں زیر صوتی ارتعاش (Infrasonic Vibrations) معلوم کرنے اور اس کی پیمائش کرنے کا ایک نمونے کا آلہ تیار کیا گیا، جو طوفان کی آمد کی اطلاع 12 سے 15 گھنٹے پہلے تک دے دیتا ہے، یہ مروجہ آلوں سے پانچ گنا زیادہ طاقت ور ہے، اس کا خیال کس نے پیدا کیا؟ مچھلی (Jelly Fish) نے، انجینئروں نے اس کے اعضا کی نقل کی، جو زیر صورت صوتی ارتعاش محسوس کرنے میں بڑے حساس ہوتے ہیں،

Soviet Land, December 1963

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، طبیعیاتی سائنس اور ٹکنالوجی درحقیقت نئے تصورات کی نقل قدرت کے زندہ نمونوں سے حاصل کرتی ہے، بہت سے مسائل جو سائنس دانوں کے تخیل پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، قدرت ان کو مدتوں پہلے حل کر چکی ہے، پھر جس طرح کیمرہ اور ٹیلی پرنٹر کا ایک نظام انسانی ذہن کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا،

---

(۱) کوئی ذی ہوش یہ کہنے کی غلطی نہیں کرے گا کہ کیمرہ اتفاق سے بن کر تیار ہو گیا ہے، مگر اس کے باوجود دنیا کے بہت سے ہوش مند یہ یقین رکھتے ہیں کہ ''آنکھ محض اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے۔''

اسی طرح یہ بھی نا قابل تصور ہے کہ کائنات کا پیچیدہ ترین نظام کسی ذہن کے بغیر اپنے آپ قائم ہو، کائنات کی تنظیم قدرتی طور پر ایک انجینئر اور ایک ناظم کا تقاضا کرتی ہے، اسی کا نام خدا ہے، ہم کو جو ذہن ملا ہے، وہ ناظم کے بغیر تنظیم کا تصور نہیں کر سکتا، اس لئے غیر معقول بات یہ نہیں ہے کہ ہم کائناتی تنظیم کے لئے ایک ناظم کا اقرار کریں، بلکہ یہ غیر معقول رویہ ہوگا کہ ہم اس تنظیم کے ناظم کو ماننے سے انکار کر دیں، حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن کے پاس خدا سے انکار کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔

3۔ کائنات کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے مانند نہیں ہے بلکہ اس کے اندر حیرت انگیز معنویت ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق و تدبیر میں کوئی ذہن کام کر رہا ہے، ذہنی عمل کے بغیر کسی چیز میں ایسی معنویت پیدا نہیں ہوسکتی، محض اندھے مادی عمل سے اتفاقی طور پر وجود میں آجانے والی کائنات میں تسلسل نظم اور معنویت پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، کائنات اس قدر حیرت انگیز طور پر موزوں اور مناسب حال ہے کہ یہ نا قابل تصور ہے کہ یہ مناسبت اور موزونیت خود بخود محض اتفاقاً واقعہ میں آگئی ہو ـــــــــ چاڈواش (Chadvalsh) کے الفاظ ہیں:

> ''ایک شخص، خواہ وہ خدا کا اقرار کرنے والا ہو یا اس کا منکر ہو، جائز طور پر اس سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ دکھائے کہ اتفاق کا توازن اس کے حق میں کس طرح ہو جاتا ہے۔'' (۱)

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لئے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہو جائیں، اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے،

The Evidence of God P.88 (۱)

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی ،مگراس کے باوجودوہ ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے،کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں، جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجئے ،اگراس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تواس پر زندگی محال ہوجاتی مثلاً کرۂ زمین،اگر چاند اتنا چھوٹا ہوتا،یعنی اس کا قطر موجودہ قطر کی نسبت سے ایک چوتھائی 1/4 ہوتا تواس کی کشش ثقل،زمین کی موجودہ کشش کا 1/6 رہ جاتی،کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوجاتا کہ ہماری دنیا پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی ،جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے،چاند پراس وقت نہ تو پانی ہے،اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے،ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بیحد سرد ہوجاتا ہے،اوردن کے وقت تنور کے مانند جلنے لگتا ہے،اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کوروک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے،اوراسی بنا پرایک سائنس داں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ(Great Balance Wheel)(۱) کا نام دیا ہے،اور ہوا کا موجودہ غلاف اڑ کر فضا میں گم ہوجاتا تواس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا،اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا،اس کے برعکس اگرزمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تواس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی،کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا،جواس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے،وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی ،اس کے دباؤ میں فی مربع انچ 15 تا 30 پونڈ کا اضافہ ہوجاتا،جس کا ردعمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتا،اوراگرزمین سورج کے اتنی بڑی ہوتی اوراس کی کثافت برقرار رہتی تواس کی

---

(۱) The Evidence of God

کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی، ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی، نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا، اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشوونما ممکن نہ رہتا، ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہوجاتا انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہوجاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہوجاتی، کیونکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے، اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جاسکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں، زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے، جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں، کوئی شخص ہندستان کی زمین پر کھڑا ہوتو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے، اور امریکہ میں کھڑا ہوتو ہندستان اس کے نیچے ہوگا، پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے، ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہئے، جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھما دیا جائے، مگر ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں، زمین کے اندر غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے، اسی دوطرفہ عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے، ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے، وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے، یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً 280 من کا دباؤ، آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا، کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے، دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے، اس لئے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا، جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا ـــــــــ جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں، جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں، اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کرسکتا، وائٹ ہڈ (A.N. Whitehead) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

> ''نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے، کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے، تو وہ ہم کو توجیہہ نہیں دے سکتی، ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا، تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں، جبکہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔''

The Age of Analysis, P85

وائٹ ہڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحبِ شعور کے زیر اہتمام نہیں ہے، تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے، یا یوں کہئے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے، فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے، ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے، گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دے گا اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا، سورج جو اس وقت ہمارے لئے زندگی کا سرچشمہ ہے، اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے، اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اگر یہ فاصلہ

گھٹ جائے، مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے، اور اگر موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہے، جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین 23 درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے، یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے، اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہو گیا ہے، اور مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں، اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا، سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان، اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہوجاتی۔

یہ کس قدر نا قابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کرلیا! اگر سائنس دانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائً زمین کا درجۂ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے، یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ، اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک زمین کا درجۂ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے، اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا، اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلاب ہوتے رہے، یہاں تک کہ غالباً ایک ملین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی، زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا ایک بڑا حصّہ خلا میں چلا گیا، ایک حصہ نے پانی کے رکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا، اور ایک حصّہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے یہ ہوا اپنی کثافت کے

اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصّہ ہے ـــــــ کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہوجاتیں یا کیوں ایسانہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار بہت زیادہ ہوتی، دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا، یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشوونما پا سکے۔

زمین کی اوپری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا، جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے، اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں، اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ زمین کے ہر حصّے میں گرتے، یہ شہابیے چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں، وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے، شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی، مگر ہوائی کرہ اپنے نہایت موزوں وبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے، ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیائی اہمیت رکھنے والی شعائیں Actinic Rays اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہنچتی ہیں، جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لئے ضرورت ہے جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہو سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے، جس میں تقریباً 78 فیصدی نائٹروجن اور 21 فیصدی آکسیجن ہے، باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں، اس فضا سے

زمین پر تقریباً 15 پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، جس میں آکسیجن کا حصّہ 3 پونڈ فی مربع انچ ہے، موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصّہ زمین کی تہوں میں جذب ہے، اور وہ دنیا کے تمام پانی کا دس میں سے آٹھ حصہ بناتا ہے آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لئے سانس لینے کا ذریعہ ہے، اور اس مقصد کے لئے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لئے ضروری تھا، مثال کے طور پر آکسیجن 21 فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا، اسی طرح اگر اس کا تناسب گھٹ کر ۱۰ فیصدی رہا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی، اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہوگئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں، یہی وہ بنیادیں ہیں، جن پر زندگی قائم ہے، اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں، ایک عالم طبیعیات کے الفاظ ہیں:۔

" Science has no explanation to offer for the facts, and to say it is accidental is to defy mathematics. P.23"

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہ کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی

کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (Density) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے، جو جمنے کے بعد ہلکا ہوجاتا ہے، یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہے،اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، اوردریاؤں جھیلوں اورسمندروں کی تہ میں بیٹھ نہیں جاتا،ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہوجائے، یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے،اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں، اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے، برف فوراً پگھل جاتا ہے، اگر پانی میں یہ خاصیّت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ امریکہ میں انڈوتھیا(Endothia) نام کی بیماری شاہ بلوط (Chestunt) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا، ''یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے''امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا،اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لئے خاص تھے، یہاں تک کہ 1900 میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا،مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پر ہو گئے، کچھ دوسرے درخت(Tulip Trees) اپنی نشوونما کے لئے شاید انھیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے، شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی سا جزو تھے،اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے،لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت

پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں، یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں، اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تہوں کے کام آسکتی ہے، ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے، ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لئے بوئی گئی آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا، چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی، یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی، وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کر دیا اور زراعت کو ناممکن بنا دیا، کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی، ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا، بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لئے نکلے، یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا، اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی، وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا، اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا، اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پالیا اور اب وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہوگیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط وتوازن (Checks and Balances) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہیں؟

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پائی جاتی ہے، یہ جامد و بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے، اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے ''پانی'' کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے اس کا ایک ہی مطلب ہوگا______ایک ایسا مرکب جس میں ۱۱،۱ فیصد ہائیڈروجن اور 88,9 فیصد آکسیجن۔ ایک سائنس داں جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے، تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش 100 درجہ سینٹی گریڈ ہے، جب تک

ہوا کا دباؤ (Atmospheric Pressure)670 ایم ایم رہے، اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لئے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے، اس طرح نقطۂ جوش سو درجہ سے کم ہوجائے گا، یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جاسکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے، اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لئے کوئی بنیاد نہ ہوتی، کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعیات کے لئے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریق عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نو وارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ عناصر میں نظم اور دوریت ہے، سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (Mendeleev) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا، جس کو دوری نقشہ (Periodic Chart) کہا جاتا ہے، اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے، اس لئے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے، جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پر ہو گئے ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کئے جاتے ہیں، جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں (Protons) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے، یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے، ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے، اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے، ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین، مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لئے ممکن ہوسکا کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے، نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ عنصر 101 کی شناخت محض اس کے ۱۷ پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی، قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق

(Periodic Chance) نہیں کہتے ، بلکہ اس کو دوری ضابطہ (Periodic Law) کہتے ہیں، مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اس کا انکار کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کرے گی۔

''11 / اگست 1999ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (Cornwall) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا'' ______ یہ محض ایک قیاسی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے، جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں، وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جا رہی ہیں، وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جا رہی ہیں، وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے، پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک فقید المثال نظم وضبط پایا جاتا ہے، ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریۂ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہہ کرتا ہے، اس کے نتیجے میں A.C. Adams اور لاویرے U.Leverrier کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کر سکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا، چنانچہ ستمبر 1946ء کو ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے، جس کو ہم اب نیپچون (Neptune) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں یہ ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہوگئی ہو۔

کائنات کی حکمت و معنویت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اندر سے ایسے امکانات رکھے گئے ہیں کہ انسان بوقت ضرورت تصرف کر کے اس کو اپنے لئے استعمال کر سکے، مثال کے طور پر نائٹروجن کے مسئلہ کو لیجئے ، ہوا کے ہر جھونکے میں نائٹروجن 78 فی صد ہوتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے کیمیائی اجزاء ہیں، جن میں نائٹروجن شامل ہوتا ہے، ان کو ہم مرکب نائٹروجن کہہ سکتے ہیں، یہی وہ نائٹروجن ہے، جس کو پودے استعمال کرتے ہیں اور جن سے ہماری غذا کا نائٹروجنی حصّہ تیار ہوتا ہے، اگر یہ نہ ہوتو انسان اور جانور بھوکوں مر جائیں۔

صرف دو طریقے ہیں، جن سے قابل تحلیل نائٹروجن مٹی میں مل کر کھاد بنتا ہے، اگر یہ نائٹروجن مٹی میں شامل نہ ہوتو کوئی بھی غذائی پودا نہ اُگے، ایک طریقہ جس سے یہ نائٹروجن مٹی میں شامل ہوتا ہے وہ مخصوص بیکٹیریائی عمل ہے، یہ بیکٹیریا دال کے پودوں کی جڑوں میں رہتے ہیں، اور ہوا سے نائٹروجن لے کر اس کو مرکب نائٹروجن کی شکل دیتے رہتے ہیں، پودا جب سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے تو اس مرکب نائٹروجن کا کچھ حصّہ زمین میں رہ جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ جس سے مٹی کو نائٹروجن ملتا ہے، وہ بجلی کا کڑکا ہے، ہر بار جب بجلی کی رو فضا میں گزرتی ہے تو وہ تھوڑے سے آکسیجن کو نائٹروجن کے ساتھ مرکب کر دیتی ہے جو کہ بارش کے ذریعہ ہمارے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے، اس طرح سے جو نائٹریٹ نائٹروجن آسانی سے مل جاتا ہے ،اس کا اندازہ سالانہ ایک ایکڑ زمین میں پانچ پونڈ ہے جو کہ تیس پونڈ سوڈیم نائٹریٹ کے برابر ہے۔ (۱)

یہ دونوں طریقے بہر حال ناکافی تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ کھیت جن میں عرصہ دراز تک کھیتی ہوتی رہتی ہے ،ان کا نائٹروجن ختم ہو جاتا ہے، اور اسی لئے کاشتکار فصلوں کا الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک ایسے مرحلے میں جبکہ اضافہ آبادی اور

---

(۱) Lyon, Bockman and Brady TheNature and Properties of Soils

کثرت کاشت کی وجہ سے مرکب نائٹروجن کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی، اور انسان کو مستقبل میں قحط کے آثار نظر آنے لگے تھے، اور یہ صرف اس صدی کے آغاز کی بات ہے کہ عین اس وقت وہ طریقہ دریافت ہوگیا جس سے ہوا کے ذریعہ مصنوعی طور پر مرکب نائٹروجن بنایا جاسکتا ہے، مرکب نائٹروجن بنانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں، ان میں سے ایک یہ تھی، کہ فضا میں مصنوعی طور پر بجلی کا کڑکا پیدا کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ ہوا میں بجلی کی چمک پیدا کرنے کے لئے تقریباً تین لاکھ ہارس پاور کی قوت استعمال کی گئی، اور جیسا کہ پہلے سے اندازہ کیا جاچکا تھا، ایک قلیل مقدار نائٹروجن کی تیار ہوگئی، مگر اب انسان کی خداداد عقل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور انسانی تاریخ کے دس ہزار سال بعد ایسے طریقے معلوم کر لئے گئے ہیں، جن سے وہ اس گیس کو کھاد میں تبدیل کرسکتا ہے، اس کے بعد انسان اس قابل ہوگیا ہے کہ وہ اپنی غذا کے اس لازمی جزو کو تیار کرسکے جس کے بغیر وہ بھوکوں مرجاتا، یہ نہایت عجیب حسن اتفاق ہے کہ زمین کی تاریخ میں پہلی بار عین وقت پر انسان قلت خوراک کا حل دریافت کرلیا، یہ المیہ ٹھیک اس وقت رفع ہوگیا جب کہ اس کے واقع ہونے کا امکان تھا۔

کائنات میں اس طرح کی حکمت ومعنویت کے بے شمار پہلو ہیں، ہماری تمام سائنسوں نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ جو کچھ ہم نے معلوم کیا ہے، اس سے بہت زیادہ ہے وہ چیز، جس کو معلوم کرنا ابھی باقی ہے، تاہم جو کچھ انسان معلوم کرچکا ہے، وہ بھی اتنا زیادہ ہے، کہ اس کے صرف عنوانات کی فہرست دینے کے لئے موجودہ کتاب سے بہت زیادہ ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی، اور پھر بھی عنوانات بچ رہیں گے، انسان کی زبان سے آلاءِ رب اور آیات الٰہی کا ہر اظہار ناقص اظہار ہے، اس کی جتنی بھی تفصیل کی جائے، جہاں زبان وقلم رکیں گے وہاں یہ احساس ضرور موجود ہوگا کہ ہم نے ''بیان'' نہیں کیا بلکہ اس کی ''تحدید'' کردی، حقیقت یہ ہے کہ اگر سارے علوم منکشف ہوجائیں، اور اس کے بعد سارے انسان اس طرح لکھنے بیٹھ جائیں کہ دنیا کے تمام وسائل ان کے لئے مُساعد ہوں، جب بھی کائنات کی

حکمتوں کا بیان مکمل نہیں ہوسکتا۔

وَلَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّالۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ؕ (لقمان:27)

ترجمہ: اگر تمام درخت قلم ہوں اور موجودہ سمندروں کے ساتھ سات اور سمندر ان کی سیاہی کا کام دیں، جب بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

جس نے بھی کائنات کا کچھ مطالعہ کیا ہے، وہ بلاشبہ اعتراف کرے گا کہ کتاب الٰہی کے ان الفاظ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، وہ صرف ایک موجودہ حقیقت کا سادہ سا اظہار ہے۔

پچھلے صفحات میں کائنات کے حیرت انگیز نظم اور اس کے اندر غیر معمولی حکمت و معنویت کا جو حوالہ دیا گیا ہے، مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہوئے، اس کی دوسرے توجیہہ کرتے ہیں، اس میں انھیں کسی ناظم و مدبر کا اشارہ نہیں ملتا، بلکہ یہ سب کچھ ان کے نزدیک محض ''اتفاق'' سے ہوگیا ہے، ٹی۔ ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروڑوں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیئر کی ایک نظم (Sonnet) نکل آئے، اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کے اندھادھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی ہے۔

The Mysterious Universe, P.3.4

یہ بات اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے، کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے، بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں، مثلاً ہوا کا جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (Pollen) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے، جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزوی اور استثنائی واقعہ کی

توجیہہ کرتا ہے،گلاب کا پورے وجود کائنات کے اندرایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس حیرت انگیز ربط ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جاسکتا''اتفاقی واقعہ'' کے لفظ میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے، پروفیسر ایڈون (Edwin Conklin) کے الفاظ میں

''زندگی کا بذریعہ حادثہ (Accident) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے پریس میں دھماکہ ہوجانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا۔''

The Evidence of god, P.174

کہا جاتا ہے کہ''اتفاق'' کے حوالے سے کائنات کی توجیہہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے، بلکہ سرجمیز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق(Purely mathematical Laws of Chance) پر مبنی ہے۔(۱) ایک مصنف لکھتا ہے:۔

> ''اتفاق (Chance) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے،جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں،اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں بآسانی امتیاز کرسکتے ہیں،اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کرسکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔''(۲)

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہوگیا، اور پھر یہ بھی فرض کرلیں کہ اس میں عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہوگیا، اگرچہ ان مفروضات کے لئے کوئی نبیاد نہیں ہے_____ جب بھی کائنات کی توجیہہ حاصل نہیں

---

(۱) The Mysterious Universe, P.3

(۲) The Evidence of god,P. 23

ہوتی، ـــــــ کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذہب کی راہ میں حائل ہو گیا ہے، بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانونِ اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کررہی ہے کہ قانون اتفاق، موجودہ کائنات کا خالق ہوسکتا ہے، کیونکہ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر اور جسامت کیا ہے، اور جو عمر او جسامت اس نے معلوم کی ہے، وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔

''اگر تم دس سکّے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگادو، اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملادو، اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو ـــــــ یہ امکان کہ نمبر ایک سکّہ پہلی بار تمھارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک ِ دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمھارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں دس ہزار میں ایک ہے، یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکّے بالترتیب تمھارے ہاتھ آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے''

یہ مثال نقل کرنے بعد کریسی ماریسن(A.Cressy Morrison) لکھتا ہے:۔

"The object in dealing with so simple a problem is to show how enormously figures multiply against chance."

Man does not Stand Alone, P.17

یعنی یہ سادہ مثال اس لئے دی گئی تا کہ یہ امر اچھی طرح واضح ہوجائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہوگیا ہے، تو اس کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی، ذی حیات اشیاء کی ترکیب زندہ خلیوں (Living Cells) سے ہوتی ہے،

خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم انحلیہ (Cytology) میں کیا جاتا ہے، ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں، ان میں سے ایک پروٹین ہے، پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے ____ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور گندھک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جواہر (Atoms) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سو سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں، اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے ، مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔

سوئزرلینڈ کے ایک ریاضی داں پروفیسر چالسا یوجین گائی (Charles Eugene Guye) نے اس کا حساب لگایا ہے، اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان 10^{160} کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہوسکتا ہے 10^{160} کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے درپے ضرب دیا جائے دوسرے لفظوں میں دس کے آگے ایک سو ساٹھ صفر ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کرکے ہلایا جائے ، اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان 10^{143} سال بعد ہے۔

پروٹین، امینوایسڈ (Amino Acids) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقہ کی ہے، جس سے یہ سلسلے باہم ملیں، اگر یہ غلط شکل

میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں، پروفیسر جے۔ بی لیتھیز (J.B.Leathes) نے حساب لگایا کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں 10^{48} طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لئے محض اتفاق سے یکجا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے، ایسا ہو جائے، دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے باوجود کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے، جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے خلیہ کا جز بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرات کیسے پیدا ہوئی، اس کا جواب اس توجیہہ میں نہیں ہے، پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جزو پروٹین _____ کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ زرہ کے وجود میں آنے کی توجیہہ ہے، جب کہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہا سنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامٹے نوائے (Le Comte Du Nouy) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لئے جس وقت، جس مقدار مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابل یقین حد تک زیادہ ہے، اس کے لئے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی 10^{84} سال نور (دس کے آگے 82 صفر) سفر کر کے اس کو پار کر سکتی ہو، یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے، کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہنچ جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے ک آئن سٹائن نے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے، وہ اس عمل کے لئے قطعاً ناکافی ہے، پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سو

ٹریلین حرکت فی سکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے، اور اس سارے عمل کے لئے جس مدت کی ضرورت ہے وہ 10^{243} (دس کے آگے 243 صفر) بلین سال ہے، مگر ''ہمیں بھولنا نہیں چاہئے'' ڈونوائے لکھتا ہے ''کہ زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جبکہ زمین ٹھنڈی ہوئی۔''

Human Destiny, P.30. 36

سائنس نے اگرچہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے ناکافی ہے، مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کر لی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے، جو کسی بڑے ستارے کے کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا، اس وقت زمین سورج کی مانند ایک مجسم شعلہ تھی، جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا، اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوکر منجمد ہوئی، اس انجماد ہی کے بعد یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جاسکتی ہے، ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (Radio-Activ Elements) کے ذریعہ معلوم ہوا ہے، تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں، اور اسی لئے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں، اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے، اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، یورنیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے، وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک

خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی، ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں، یورنیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں، اور بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزو ہیں، جبکہ یہ چٹان منجمد ہوئی یورنیم کے ساتھ ہم سیسی پاتے ہیں، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورنیم کے ساتھ پایا جاتا ہے، وہ یورنیم کے انتشار (Disitegration of Uranium) سے وجود میں آیا ہے ، کیونکہ یورنیم سے بنا ہوا سیسہ، عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے، اسلئے سیسہ کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورنیم سے بنا ہے یا نہیں، اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورنیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے، اور چونکہ یورینیم چٹان میں اس وقت سے ہے، جب کہ وہ چٹان منجمد ہوئی، اس لئے ہم اس کے ذریعے سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو بلین سال گزر چکے ہیں، یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قدیم ترین چٹانیں ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا یا تگنا ہو، مگر ارضیاتی مشاہدہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ جے، ڈبلیو، این سولیون نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے [۱] اب ظاہر ہے کہ جب صرف ایک غیر ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے سنکھ مہا سنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آ گئیں اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات

Limiations of Science,P.78 (۱)

پیدا ہوکر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے، اور پھر انھیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیا سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق اتفاقاً کیسے وجود میں آ گئی جب کہ نظریۂ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے، ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہے کہ ماہر ریاضی پاچو(Patau) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے، [1] اس سے اندازہ کیجئے کہ اگر محض ارتقاء کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے جدامجد کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہے، تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔بی کریڈر Martin Broks Kreider کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں۔

"The mathematical probability of a chance occurrrnce of all the necessary factors in the right proportion is almost nil."

The Evidence of God ,P.67

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہوجانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کے لغویت واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''اتفاق'' سے نہ کوئی ایٹم یا مالے کیول وجود میں آ سکتا ہے، اور نہ وہ ذہن پیدا ہوسکتا ہے، جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی، خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے، یہ نظریہ نہ صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے، بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا، یہ ایسی ہی لغو بات ہے، جیسے کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی

---

(۱) The Evidence of God ,P.117

فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہوسکتا ہے، ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لئے فرق، کشش ارضی، پانی اور گلاس کہاں سے وجود میں آ گئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (Haeckel) نے کہا تھا۔ ''مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا۔'' مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لئے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوے کی تردید کر رہا ہے، بہت خوب کہا ہے ماریسن نے:

> ''ہیکل نے یہ کہتے ہوئے جین اور خود زندگی کے مسئلہ کو نظر انداز کر دیا، انسان کو وجود میں لانے کے لئے اس کو سب سے پہلے نا قابل مشاہدہ ایٹم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر جین بنانا ہوگا، اور اس کو زندگی دینی ہوگی، پھر بھی اس کی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروروں میں ایک کا ہے، اور بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہو جائے تو اس کو وہ اتفاق (Accident) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (Intelligence) کا ایک نتیجہ قرار دے گا۔''

Man does not Stand Alone,P.87

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبعیات جارج ارل ڈیوس (Earl Davis) کے الفاظ پر ختم کروں گا۔

> ''اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے، اس طرح اگر چہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے، لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی، میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالمِ مادی کی تخلیق کی ہے، اور اس عالم کا وہ خود کوئی جز نہیں، بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم و مدبر ہے۔''

The Evidence of god, P.71

دلیلِ آخرت

مذہب جن حقیقتوں کو ماننے کی ہمیں دعوت دیتا ہے، ان میں سے ایک اہم ترین حقیقت ــــــــ آخرت کا تصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے، جہاں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، موجودہ دنیا انسان کی امتحان گاہ ہے، یہاں ایک خاص عرصہ کے لئے انسان کو رکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب اس کا مالک اسے توڑ کر دوسری دنیا دوسرے ڈھنگ پر بنائے گا، وہاں تمام انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، ہر ایک نے موجودہ دنیا میں جو اچھے یا برے عمل کئے ہیں، وہ تمام وہاں خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے، اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دی جائے گے۔

یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اس کو جانچنے کے لئے ہم اس پر چند پہلوؤں سے غور کریں گے۔

امکان

پہلی بات یہ ہے کہ کائنات کے موجودہ نظام میں کیا اس طرح کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن نظر آتا ہے کیا یہاں کچھ ایسے واقعات اور اشارے پائے ہیں، جو اس دعوے کی تصدیق کر رہے ہوں،

یہ نظریہ سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ انسان اور کائنات اپنی موجودہ شکل میں ابدی نہ ہوں، اور یہ دونوں چیزیں ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق بالکل یقینی ہیں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں انسان کے لئے بھی موت ہے اور کائنات کے لئے بھی موت، دونوں میں سے کوئی بھی موت کے خطرے سے خالی نہیں۔

جو لوگ دوسری دنیا کو نہیں مانتے وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اسی دنیا کو اپنی ابدی

خوشیوں کی دنیا بنائیں، انھوں نے اس بات کی بہت تحقیق کی کہ موت کیوں آتی ہے تا کہ اس کے اسباب کو روک کر زندگی کو جاوداں بنایا جاسکے، مگر انھیں اس سلسلے میں قطعی ناکامی ہوئی ــــــــ ہر مطالعہ نے بالآخر یہی بتایا کہ موت یقینی ہے، اس سے چھٹکارا نہیں۔

''موت کیوں آتی ہے'' ــــــــ اس کے تقریباً دوسو جوابات دیے گئے ہیں، جسم ناکارہ ہوجاتا ہے، اجزائے ترکیبی صرف ہوچکتے ہیں، رگیں پتھرا جاتی ہیں، متحرک البومن کی جگہ کم متحرک البومن آجاتے ہیں، مربوط کرنے والے نسیج بیکار ہوجاتے ہیں، جسم میں آنتوں کے بیکٹیریا کا زہر دوڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

جسم کے ناکارہ ہونے کی بات بظاہر درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مشینیں، جوتے کپڑے، سبھی ایک خاص مدت کے بعد ناکارہ ہوجاتے ہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ پوستین کی طرح ہمارا جسم بھی، جلد یا بدیر پرانا ہوکر ختم ہوجاتا ہو، مگر سائنس اس کی تائید نہیں کرتی، سائنسی تشریح کے مطابق جسم انسانی نہ پوستین کی طرح ہوتا ہے، نہ مشین سے ملتا جلتا ہے، اور نہ چٹان سے مشابہ ہے، اگر اسے تشبیہ دی جاسکتی ہے، تو دریا سے جو ہزار سال پہلے بھی بہا کرتا تھا، اور آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ دریا پرانا ہوتا ہے یا ناکارہ ہو جاتا ہے، اسی بنیاد پر کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر لنس پالنگ نے کہا ہے کہ نظریاتی طور پر انسان بڑی حد تک لافانی ہے، اس کے جسم کے خلیے ایسی مشین ہیں، جو خود بخود اپنی خرابی دور کر لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان بوڑھا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے ــــــــ اس کے اسباب ابھی تک راز بنے ہوئے ہیں۔

ہماری زندگی کی مسلسل تجدید ہوتی رہتی ہے، ہمارے خلیوں میں البومن کے سالمے بنتے اور تلف ہوتے اور پھر بنتے رہتے ہیں، خلیے (سوائے اعصابی خلیوں کے) برابر تلف ہوتے اور ان کی جگہ نئے بنتے رہتے ہیں، اندازہ لگایا گیا ہے، کہ کوئی چار مہینے کے عرصے میں انسان کا خون بالکل ہی نیا ہوجاتا ہے، اور چند سال کے عرصے میں انسانی جسم کے تمام ایٹم

پوری طرح بدل جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نوعیت ایک ڈھانچے کی نہیں بلکہ دریا کی سی ہے، یعنی وہ ایک عمل ہے، ایسی حالت میں جسم کے پرانے اور ناکارہ ہونے کے تمام نظریے بے بنیاد ہو جاتے ہیں، وہ تمام چیزیں جو زندگی کے ابتدائی برسوں میں خراب ہوگئی تھیں، زہر آلود اور بیکار ہو چکی تھیں، وہ جسم سے کب کی خارج ہو چکیں، پھر ان کی موت کا سبب قرار دینا کیا معنی ــــــــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت کا سبب آنتوں اور رگوں اور دل میں نہیں، بلکہ اس کا سبب کہیں اور ہے۔

ایک توجیہہ یہ ہے کہ اعصابی خلیے موت کا سبب ہیں، کیونکہ اعصابی خلیے زندگی بھر وہی رہتے ہیں، یہ کبھی نہیں بدلتے، چنانچہ انسان کے اندر اعصابی خلیے سال بہ سال کم ہوتے جاتے ہیں، اور مجموعی طور پر اعصابی نظام کمزور ہوتا جاتا ہے، اگر یہ توجیہہ صحیح ہے، اور اعصابی نظام ہی نظامِ جسمانی کا کمزور حصہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نظامِ جسمانی سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہئے جن میں اعصابی نظام ہوتا ہی نہیں۔

مگر مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، درخت میں اعصابی نظام نہیں ہوتا اور وہ سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہتا ہے، مگر گیہوں میں بھی اعصاب نہیں تھے مگر وہ صرف سال بھر زندہ رہتا ہے، اور اسی طرح امیبا کیڑے میں بھی اعصاب نہیں ہوتے لیکن وہ صرف آدھ گھنٹہ زندہ رہتا ہے، اسی طرح اس توجیہہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ نسل کے حیوانات کی عمر، جن کا اعصابی نظام مکمل ترین ہوتا ہے، سب سے زیادہ ہونی چاہئے، مگر ایسا نہیں ہے، مگر مچھ، کچھوا اور پاٹک مچھلی سب سے لمبی عمر پاتے ہیں۔

اس طرح موت کو غیر یقینی بنانے کے لئے اس کے اسباب کی جتنی چھان بین کی گئی ہے، وہ سب ناکامی پر ختم ہوئی ہے، اور یہ امکان اب بھی بدستور باقی کہ سارے انسانوں کو ایک مقرر مدت پر مرنا ہے، اور ایسا کوئی امکان اب تک ثابت نہ ہو سکا کہ موت نہیں آئے گی، ڈاکٹر الکسس کیرل نے اسی مسئلہ پر زمان داخلی (Inward Time) کے عنوان سے لمبی

بحث کی ہے، اوراس سلسلے کی کوششوں کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''انسان بقا کی تلاش اور جستجو سے کبھی نہیں اکتائے گا، مگراس کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ جسمانی ساخت کے چند قوانین کا پابند ہے، وہ عضویاتی زمان (Physilogical Time) کو روکنے اور غالباً ایک حدتک اس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوسکتا ہے، (۱) لیکن وہ موت پر فتح نہیں پا سکتا۔''

Man the Unknown .P.175

اسی طرح نظام کائنات کی موجودہ شکل کا درہم برہم ہونا بھی ایک ایسی چیز ہے، جو بالکل واقعاتی طور پر سمجھ میں آتی ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کائنات میں ہم جن چھوٹی چھوٹی قیامتوں سے واقف ہیں، وہی آئندہ کسی وقت زیادہ بڑے پیمانے پر ظاہر ہونے والی ہے، یہ صرف موجودہ مقامی قیامتوں کے عالمی پیمانے پر واقع ہونے کی پیشین گوئی ہے۔

سب سے پہلا تجربہ جو ہم کو قیامت کے امکان سے باخبر کرتا ہے، وہ زلزلہ ہے، زمین کا اندرونی حصّہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوا کی شکل میں ہوتا ہے، یہ مادہ مختلف شکلوں میں زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز محسوس ہوتی ہے، اور کشمکش کی وجہ سے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں ـــــــ اسی کا نام زلزلہ ہے، یہ زلزلہ آج بھی انسان کے لئے سب سے زیادہ خوفناک لفظ ہے، یہ انسان کے اوپر قدرت کا ایسا حملہ ہے جس میں فیصلے کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، زلزلہ کے مقابلے میں انسان بالکل بے بس ہے، یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادے کے اوپر آباد ہیں، جس سے صرف 50 کیلومیٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہہ ہم کو الگ کرتی ہے، جو زمین کے مقابلے میں ویسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا، ایک جغرافیہ داں کے الفاظ

---

(۱) یعنی جوانی کی مدت کو بڑھانے اور بڑھاپے کو موخر کرنے میں۔

میں ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنّم (Physical hell) دہک رہا ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ہم ایک عظیم ڈائنامیٹ کے اوپر کھڑے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ کر سارے نظامِ ارضی کو درہم برہم کرسکتا ہے۔

George gamow

Biography of the Rarth, P.82

یہ زلزلے دنیا کے تقریبًا ہر حصے میں اور ہر روز آتے ہیں، لیکن جغرافیائی اعتبار سے وہ زیادہ تعداد میں وہاں محسوس ہوتے ہیں، جہاں آتش فشاں پہاڑ ہیں، سب سے قدیم تباہ کن زلزلہ جس سے تاریخ واقف ہے، وہ چین کے صوبہ شنسی (Shensi) کا زلزلہ ہے، جو 1556ء میں آیا تھا، اس زلزلے میں آٹھ لاکھ سے زیادہ اشخاص ہلاک ہوگئے، اسی طرح یکم نومبر 1755ء کو پرتگال میں زلزلہ آیا جس نے لزبن (Lisbon) کا پورا شہر تباہ کردیا، اس زلزلے میں چھ منٹ کے اندر تیس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے، تمام عمارتیں مسمار ہوگئیں، اندازہ کیا گیا ہے، کہ اس زلزلے میں یورپ کے رقبہ کا چوگنا حصّہ ہل گیا تھا، اسی نوعیت کا ایک شدید زلزلہ 1897ء میں آسام میں آیا تھا، جو دنیا کے پانچ انتہائی بڑے زلزلوں میں شمار ہوتا ہے، اس سے شمالی آسام میں ہولناک تباہی آئی تھی، اس زلزلے نے دریائے برہم پتر کا رخ بدل دیا اور ایورسٹ کی چوٹی ابھر کر سو فٹ اوپر چلی گئی۔

زلزلہ دراصل چھوٹے پیمانے کی قیامت ہے، جب دہشت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے، جب پختہ مکانات تاش کے پتوں کی گھروندے کی طرح گرنے لگتے ہیں، جب زمین کا اوپری حصّہ دھنس جاتا ہے، اور اندرونی حصّہ اوپر آجاتا ہے، جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کرلیتی ہیں، جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہوجاتی ہیں، جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں ــــــ یہ زلزلے کا وقت ہوتا ہے، اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلے میں کس

قدر بے بس ہے، یہ زلزلہ بالکل اچانک آتے ہیں، درحقیقت زلزلے کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا، یہ زلزلے گویا اچانک آنے والی قیامت کی پیشگی اطلاع ہیں، یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا مالک کس طرح زمین کے موجودہ نظام کو توڑنے پر پوری طرح قادر ہے۔

یہی حال بیرونی کائنات کا ہے، کائنات نام ہے، ایک ایسے لامحدود خلا کا جس میں بے انتہا بڑے بڑے آگ کے الاؤ (ستارے) بے شمار تعداد میں اندھا دھند گردش کررہے ہیں، جیسے بے شمار لٹّو کسی فرش پر ہماری تمام سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں۔

یہ گردش کسی بھی وقت زبردست ٹکراؤ کی صورت اختیار کرسکتی ہے، اس وقت کائنات کی حالت بہت بڑے پیمانے پر ایسی ہی ہوگی جیسے کروڑوں بمبار ہوائی جہاز بموں سے لدے ہوئے فضا میں اڑ رہے ہوں اور یکایک سب کے سب باہم ٹکرا جائیں، اجرام سماوی کا اس قسم کا ٹکراؤ کسی بھی درجہ میں حیرت انگیز نہیں ہے بلکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکرا کیوں نہیں جاتے، علم الافلاک کا مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ ستاروں کا باہم ٹکرا جانا ممکن ہے، چنانچہ شمسی نظام کے وجود میں آنے کی ایک توجیہہ اسی قسم کے ٹکراؤ پر کی گئی ہے، اس ٹکراؤ کو اگر ہم بڑے پیمانے پر قیاس کرسکیں تو ہم نہایت آسانی سے زیربحث امکان کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ دراصل اسی واقعہ کا دوسرا نام ''قیامت'' ہے، نظریہ آخرت کا یہ دعویٰ کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہوجائے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو واقعہ کائنات کے اندر ابتدائی شکل میں موجود ہے، وہی ایک روز انتہائی شکل میں پیش آنے والا ہے ـــــــــ قیامت کا آنا ہمارے لئے ایک معلوم حقیقت ہے ـــــــــ فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے امکان کی حد تک جانتے ہیں ـــــــــ اور کل اسے واقعہ کی صورت میں دیکھیں گے۔

آخرت کے امکان کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ زندگی بعد موت کا مسئلہ ہے، ''کیا مرنے

کے بعد بھی کوئی زندگی ہے'' موجودہ ذہن اپنے آپ سے سوال کرتا ہے، اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے ــــــــ ''نہیں مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، کیونکہ ہم جس زندگی سے واقف ہیں وہ مادی عناصر کی ایک خاص ترتیب کے اندر پائی جاسکتی ہے، موت کے بعد یہ ترتیب باقی نہیں رہتی، اس لئے موت کے بعد کوئی زندگی بھی نہیں ہوسکتی''

ٹی، آر، مائلز (T.R.Miles) بعث بعد الموت کو محض ایک تمثیلی حقیقت قرار دیتا ہے، اور اس کو ایک لفظی حقیقت (Literal Truth) کے طور پر ماننے سے انکار کرتا ہے ''میرے نزدیک'' وہ کہتا ہے ''یہ ایک مضبوط مقدمہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی زندہ رہتا ہے، یہ بالکل لفظی طور پر ایک حقیقت ہوسکتی ہے، اور اس قابل ہے تجربے سے اس کا غلط یا صحیح ہونا معلوم کیا جاسکے، مشکل صرف یہ ہے جب تک ہم کو موت نہ آئے، اس کا قطعی جواب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، مگر یہ قیاس کرنا ممکن ہے۔'' اب چونکہ قیاس اس کے خلاف ہے، اس لئے اس کے نزدیک یہ لفظی حقیقت نہیں، وہ قیاس یہ ہے:۔

> ''علم الاعصاب (Neurology) کے مطابق خارجی دنیا اور اس سے تعلقات کا علم صرف اس وقت ممکن ہے، جب کہ انسانی دماغ معمول کے مطابق کام کر رہا ہو اور موت کے بعد جبکہ دماغ کی تنظیم منتشر ہو جاتی ہے، اس قسم کا ادراک (Awarenss) ناممکن ہے۔''(۱)

مگر اس سے زیادہ قوی قیاسات دوسرے موجود ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جسم کے ذرات مادی کا انتشار زندگی کو ختم نہیں کرتا، زندگی ایک الگ اور مستقل بالذات چیز ہے، جو ذرات کی تبدیلی کے باوجود باقی رہتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کا جسم بعض خاص قسم کے اجزا سے مل کر بنا ہے، جس کی مجموعی اکائی کو خلیہ (Cell) کہتے ہیں، یہ خلیے نہایت پیچیدہ ساخت کے چھوٹے چھوٹے ریزے

Religion and the Scientific Outlook , P. 206 (۱)

ہیں،جن کی تعداد ایک متوسط قد کے انسان میں تقریباً 26 پدم ہوتی ہے، یہ گویا بے شمار چھوٹی چھوٹی اینٹیں ہیں،جن کے ذریعہ ہمارے جسم کی عمارت تعمیر ہوئی ہے،فرق یہ ہے کہ عمارت کی اینٹیں پوری زندگی بھر وہی کی وہی رہتی ہیں، جوشروع میں اس کے اندر لگائی گئی تھیں، مگرجسم کی اینٹیں ہروقت بدلتی رہتی ہیں،جس طرح ہر چلنے والی مشین کے اندر گِھساؤ (Depreciation) کا عمل ہوتا ہے،اسی طرح ہماری جسمانی مشین بھی گھستی ہے،اوراس کی ''اینٹیں'' [۱] مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کرکم ہوتی رہتی ہیں، یہ کمی غذا سے پوری ہوتی ہے ،غذا ہضم ہوکر ہمارے جسم کے لئے وہ تمام اینٹیں مہیّا کرتی ہے، جوٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہرروز ہمارے جسم کودرکار ہوتی ہیں گویا جسم نام ہے خلیوں کے ایک ایسے مرکب کا جو ہرآن اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہو،اس کی مثال بہتے ہوئے دریا کے ایک گھاٹ کی ہے جو ہروقت پانی سے بھرا رہتا ہے مگر ہروقت وہی پانی نہیں ہوتا جو پہلے تھا بلکہ ہرآن وہ اپنے پانی کو بدل دیتا ہے،گھاٹ وہی ہوتا ہے،مگر پانی وہی نہیں رہتا۔

اس طرح ہرآن ہمارے جسم میں ایک تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے ،جب جسم کی پچھلی تمام اینٹیں ٹوٹ کرنکل جاتی ہیں، اوران کی جگہ مکمل طور پرنئی اینٹیں لے لیتی ہیں، بچے کے جسم میں یہ عمل جلد جلد ہوتا ہے،اورعمر کے بڑھنے سے اس کی رفتار سست ہوتی رہتی ہے،اگر پوری عمر کا اوسط لگایا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر دس سال میں جسم کے اندر یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے ،ظاہری جسم کے خاتمے کا یہ عمل برابر ہوتا رہتا ہے، مگراندر کا انسان اسی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے،اس کا علم ،اس کا حافظہ،اس کی تمنائیں ،اس کی عادتیں اس کے تمام خیالات بدستور باقی رہتے ہیں، وہ اپنی عمر کے

---

(۱) خلیہ کو''اینٹ'' یہاں محض ظاہری مشابہت کی بنا پر کہا گیا ہے،ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خلیہ ایک نہایت پیچیدہ مرکب ہے جو بذاتِ خود ایک مکمل جسم رکھتا ہے،اوراس کے مطالعہ کے لئے ایک علیٰحدہ سائنس وجود میں آچکی ہے،جس کا نام Cytology ہے۔

ہر مرحلے میں اپنے آپ کو وہی سابق ''انسان'' محسوس کرتا ہے، جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی آنکھ ،کان، ناک، ہاتھ، پاؤں غرض ناخن سے بال تک ہر ہر چیز بدل چکی ہوتی ہے۔

اب اگر جسم کے خاتمہ کے ساتھ اس جسم کا انسان بھی مرجاتا ہوتو خلیوں کی تبدیلی سے اسے بھی متاثر ہونا چاہئے ،مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسانہیں ہوتا، یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان یا انسانی زندگی جسم سے الگ کوئی چیز ہے جو جسم کی تبدیلی اور موت کے باوجود اپنا وجود باقی رکھتی ہے، وہ ایک گھاٹ ہے جس کی گہرائی میں اجسام یا دوسرے الفاظ میں خلیوں کی ایک مسلسل آمدورفت جاری ہے، چانچہ ایک سائنس داں نے حیات یا انسانی ہستی کو ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے، جو مسلسل تغیرات کے اندر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے_____اس کے الفاظ میں :۔

Personality as changelessness in change.

اگر موت محض جسم کے خاتمے کا نام ہوتو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے ہر عمل کی تکمیل کے بعد گویا انسان ایک بار مر گیا ،اب اگر ہم اس کو دیکھتے ہیں تو یہ دراصل اس کی دوسری زندگی ہے، جو اس نے مر کر حاصل کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس سال کی عمر کا ایک زندہ شخص جس کو ہم اپنی آنکھوں سے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، وہ اپنی اس مختصر سی زندگی میں کم ازکم پانچ بار مکمل طور پر مر چکا ہے، پانچ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو چھٹی بار کی موت کے بارے میں آخر کیوں یقین کرلیا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ لازمًا مر جائے گا، اس کے بعد اس کے لئے زندگی کی کوئی صورت نہیں۔

بعض لوگ اس دلیل کو تسلیم نہیں کریں گے، وہ کہیں گے کہ وہ ذہن یا اندرونی وجود جس کو تم انسان کہتے ہو، وہ دراصل کوئی علیٰحدہ چیز نہیں ہے بلکہ خارجی دنیا کے ساتھ جسم کے تعلق سے پیدا ہوا ہے، تمام جذبات وخیالات مادی عمل کے دوران میں اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، جس طرح دھات کے دو ٹکڑوں کی رگڑ سے زارت پیدا ہوتی ہے، جدید فلسفہ روح کے مستقل

وجود کا انتہائی مخالف ہے، جیمز کہتا ہے، کہ شعور ایک ہستی (Entity) کے طور پر موجود نہیں ہے بلکہ ایک عمل (Function) کے طور پر موجود ہے، وہ ایک کارروائی (Process) ہے، ہمارے زمانے کے فلسفیوں کی بہت بڑی تعداد نے اصرار کیا ہے کہ شعور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خارج سے پیدا ہونے والے ایک ہیجان کا عصبی جواب (Nervous Response) ہے، اس تصور کے مطابق موت یعنی جسمانی نظام کے منتشر ہونے کے بعد انسان کی موجودگی کا کوئی سوال نہیں، کیونکہ وہ مرکز اعصاب ہی اس کے بعد باقی نہیں رہا، جو خارجی دنیا کے تعامل سے زندگی کا جواب ظاہر کرے نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی بعد موت کا تصور بالکل غیر عقلی تصور ہے ــــــــ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

میں کہوں گا کہ انسان کی حقیقت اگر یہی ہے تو یقیناً ہمارے لئے ممکن ہونا چاہئے کہ ہم ایک زندہ اور باشعور انساان کو پیدا کر سکیں، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کہ انسان کا جسم کن عناصر سے مل کر بنتا ہے، تمام عناصر بہت کثیر مقدار میں زمین کے اندر اور اس کی فضا میں قابل حصول حالت میں موجود ہیں، ہم نے جسم کے اندرونی نظام کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ معلوم کر لیا ہے، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کہ انسانی جسم کا ڈھانچہ اور اس کے رگ وریشے کس طرح بنائے گئے ہیں، پھر ہمارے پاس ایسے بے شمار ماہر آرٹسٹ موجود ہیں، جو کمال درجہ مطابقت کے ساتھ انسان کی مانند ایک جسم بنا کر کھڑا کر دیں، مخالفین روح کو اگر اپنے نظریے پر یقین ہے تو وہ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بہت سے انسانی جسم تیار کر کے زمین کے مختلف حصوں میں کھڑا کر دیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب خارجی دنیا کے اثرات پڑنے سے یہ ڈھانچے چلنے اور بولنے لگیں گے۔

یہ زندگی کے باقی رہنے کے امکان کی بحث تھی، اب اس مقصد کے اعتبار سے غور کیجئے جس کے لئے مذہب دوسری زندگی کے اوپر عقیدہ رکھتا ہے مذہبی تصور کے مطابق زندگی کا بقا نشئے کی ''آمدورفت'' کا نام نہیں ہے جو شیشہ ساعت (Sand Glass) کی طرح بس

خالی اور پر ہوتی رہے، اس سے آگے اس کا اور کوئی مقصد نہ ہو ـــــــ بلکہ دوسری زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے، اور وہ یہ کہ موجودہ دنیا کی اچھائیوں اور برائیوں کا بدلہ دیا جائے۔

عقیدۂ آخرت کا یہ جزو بھی اس وقت بالکل ممکن نظر آنے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں حیرت انگیز طور پر ہر شخص کا نامۂ اعمال رات دن ایک لمحہ کے وقفہ کے بغیر ضبط (Record) کیا جارہا ہے آدمی تین شکلوں میں اپنی ہستی کو ظاہر کرتا ہے ـــــــ نیت، قول اور عمل، یہ تینوں چیزیں مکمل طور پر محفوظ کی جارہی ہیں، ہمارا ہر خیال، ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور ہماری تمام کارروائیاں کائنات کے پردہ پر اس طرح نقش ہورہی ہیں کہ کسی بھی وقت ان کو نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جاسکے، اور یہ معلوم ہوسکے کہ دنیا کی زندگی میں کس نے کیا کہا، کس کی زندگی شر کی زندگی تھی، اور کس کی زندگی خیر کی زندگی۔

جو خیالات ہمارے دل میں گزرتے ہیں، ہم بہت جلد انھیں بھول جاتے ہیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے، مگر جب ہم مدتوں کی ایک بھولی ہوئی بات کو خواب میں دیکھتے ہیں یا ذہنی اختلال کے بعد آدمی ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو اس کے فراموش شدہ ماضی سے متعلق ہیں، تو یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کا حافظہ اتنا ہی نہیں ہے، جتنا شعوری طور پر وہ محسوس کرتا ہے، حافظہ کے کچھ خانے ایسے بھی ہیں، جو بظاہر شعور کی گرفت میں نہیں رہتے، مگر وہ موجود ہوتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے خیالات مستقل طور پر اپنی پوری شکل میں محفوظ رہتے ہیں، حتیٰ کہ ہم چاہیں بھی تو انھیں محو نہیں کرسکتے، یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی شخصیت صرف وہی نہیں ہے، جسے ہم شعور کہتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس نفس انسانی کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے، جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے، یہ حصّہ جسے فرائڈ تحت شعور (Sub-Conscious) یا لاشعور (Unconscious) کا نام دیتا ہے، یہ ہماری شخصیت کا بہت بڑا حصّہ ہے، نفس انسانی کی مثال سمندر میں تیرتے ہوئے تودۂ

برف (Iceberg) کی سی ہے، جس کا صرف نواں حصّہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے، اور بقیہ آٹھ حصّے سطح سمندر کے نیچے رہتے ہیں، یہی تحت شعور ہے جو ہمارے تمام خیالات اور ہماری نیتوں کو محفوظ رکھتا ہے، فرائڈ اپنے اکتیسویں لیکچر میں کہتا ہے:۔

"منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور (Id) کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے ،مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زایل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔۔۔۔لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو، اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفویں کا یہ دعویٰ ہوجا تا ہے کہ ہمارے دماغی انفعال وقت اور فاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں، لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو، لاشعور میں وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت نگیز حقیقت ہے، جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ایسے خیالات (Conative Impulses) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں اور دسیوں سال تک اس طرح محفوظ رہتے ہیں، گویا ابھی کل وجود میں آئے۔

New introductory Lectures on Psycho-Analysis,
London, 1969, P.99

تحت شعور کا یہ نظریہ اب نفسیات میں عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بات جو آدمی سوچتا ہے، اور ہر اچھا یا برا خیال جو اس کے دل میں گزرتا ہے، وہ سب کا سب نفس انسانی میں اس طرح نقش ہوجا تا ہے کہ پھر کبھی نہیں مٹتا، وقت کا گزرنا یا حالات کا بدلنا اس کے اندر ذرہ برابر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا ______ یہ واقعہ انسانی ارادہ کے بغیر ہوتا ہے، خواہ انسان اسے چاہے یا نہ چاہے۔

فائڈ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ نیات اور اعمال کا اس احتیاط اور حفاظت کے ساتھ تحت شعور میں ضبط رہنا کارخانۂ قدرت کے اندر کون سے مقصد کو پورا کرتا ہے، اس لئے وہ فلسفیوں کو اس مسئلے پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے، مگر اس واقعہ کو آخرت کے نظریے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو فوراً اس کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس امکان کو ظاہر کرتا ہے کہ جب دوسری زندگی شروع ہوگی تو ہر شخص اپنے پورے نامۂ اعمال کے ساتھ وہاں موجود ہوگا، آدمی کا خود اپنا وجود گواہی دے رہا ہوگا کہ کن نیتوں اور کن خیالات کے ساتھ اس نے دنیا میں زندگی بسر کی تھی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ (ق)

ترجمہ: اور ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں، اور ہم اس کے رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اب قول کے مسئلے کو لیجئے، نظریۂ آخرت یہ کہتا ہے کہ آدمی اپنے اقوال کے لئے جواب دہ ہے، آپ خواہ بھلی بات کہیں یا کسی کو گالی دیں، آدمی اپنی زبان کو سچائی کا پیغام پہنچانے کے لئے استعمال کرے یا وہ شیطان کا مبلغ بن جائے، ہر حال میں ایک کائناتی انتظام کے تحت اس کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے (مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ) اور یہ ریکارڈ آخرت کی عدالت میں حساب کے لئے پیش ہوگا۔

یہ بھی ایسی چیز ہے جس کا ممکن الوقوع ہونا ہمارے معلوم دنیا کے عین مطابق ہے، ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص بولنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت دیتا ہے تو اس حرکت سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں، جس طرح ساکن پانی میں پتھر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں، اگر آپ ایک برقی گھنٹی کو شیشہ کے اندر مکمل طور پر بند کر دیں اور بجلی کے ذریعہ سے اسے بجائیں تو آنکھوں کو وہ گھنٹی بجتی ہوئی نظر آئے گی، مگر آواز سنائی نہیں دے گی، کیونکہ شیشہ

بند ہونے کی وجہ سے اس کی لہریں ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہیں، یہی لہریں ہیں، جو ''آواز'' کی صورت میں ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں اور کان کے آلات انھیں اخذ کر کے ان کو دماغ تک پہنچادیتے ہیں اور اس طرح ہم بولے ہوئے الفاظ کو سمجھنے لگتے ہیں، جس کو ''سننا'' کہا جاتا ہے۔

ان لہروں کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ پیدا ہونے کے بعد مستقل طور پر فضا میں باقی رہتی ہیں، اور یہ ممکن ہے کہ کسی بھی وقت انھیں دہرایا جاسکے، اگرچہ سائنس ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ ان آوازوں یا صحیح تر الفاظ میں ان لہروں کو گرفت کر سکے جو قدیم ترین زمانے سے فضا میں حرکت کر رہی ہیں، اور نہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی خاص کوشش ہوئی ہے، تاہم نظری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایسا آلہ بنایا جاسکتا ہے، جس سے زمانۂ قدیم کی آوازیں فضا سے لے کر اسی طرح سنی جاسکیں جس طرح ہم ریڈیو سٹ کے ذریعہ لہروں کو فضا سے وصول کر کے سنتے ہیں، جو کسی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے بھیجی گئی ہوں۔

فی الحال اس سلسلے میں جو مشکل ہے، وہ ان کو گرفت کرنے کی نہیں ہے، بلکہ الگ کرنے کی ہے، ایسا آلہ بنانا آج بھی ممکن ہے، جو قدیم آوازوں کو گرفت کر سکے، مگر ابھی ہم کو ایسی کوئی تدبیر نہیں معلوم جس کے ذریعہ سے بے شمار ملی ہوئی آوازوں کو الگ کر کے سنا جاسکے، یہی وقت ریڈیو نشریات میں بھی ہے، مگر اس کو ایک مصنوعی طریقہ اختیار کر کے حل کر لیا گیا ہے، دنیا بھر میں سیکڑوں ریڈیو اسٹیشن ہیں، جو ہر وقت مختلف قسم کے پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں، یہ تمام پروگرام ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے ہر وقت ہمارے گرد و پیش گزرتے رہتے ہیں، بظاہر یہ ہونا چاہئے کہ جب ہم ریڈیو کھولیں تو بیک وقت بہت سی نا قابل فہم آوازیں ہمارے کمرے میں گونجنے لگیں، مگر ایسا نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نشرگاہیں، اپنی اپنی ''آواز'' کو مختلف طولِ موج پر نشر کرتی ہیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی، اس طرح مختلف نشرگاہوں سے نکلی ہوئی آوازیں مختلف طول کی موجوں میں فضا کے اندر پھیلتی

ہیں، اب جہاں آواز جس میٹر بینڈ پر نشر کی جاتی ہے، اس پر اپنے ریڈیوسٹ کی سوئی گھما کر ہم وہاں کی آواز سن لیتے ہیں۔

اسی طرح غیر مصنوعی آوازوں کو الگ کرنے کا کوئی طریقہ ابھی دریافت نہیں ہوا ہے، ورنہ آج بھی ہم ہر زمانے کی تاریخ کو اس کی اپنی آواز میں سن سکتے تھے، تاہم اس سے یہ امکان قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے، اس تجربہ کی روشنی میں نظریۂ آخرت کا یہ جزو ہمارے لئے بعید از قیاس نہیں رہتا کہ انسان جو کچھ بولتا ہے، وہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے مطابق ایک روز ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہوگی، ایران کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق 1953ء میں جب مقدمے کے دوران نظر بند تھے تو ان کے کمرے میں خفیہ طور پر ایسی ریکارڈنگ مشین لگا دی گئی تھیں، جو ہر وقت متحرک رہتی تھیں، اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کا ریکارڈ کر لیتی تھیں تاکہ عدالت میں ان کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے ہمارا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسی طرح ہر شخص کے ساتھ خدا کے فرشتے یا دوسرے لفظوں میں بہت غیر مرئی محافظین (Recorders) لگے ہوئے ہیں، جو ہمارے منھ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو نہایت درجہ صحت کے ساتھ کائنات کی پلیٹ پر نقش کر رہے ہیں۔

اب عمل کے مسئلہ کو لیجئے، اس سلسلے میں بھی ہماری معلومات حیرت انگیز طور پر اس کا ممکن الوقوع ہونا ثابت کرتی ہیں، سائنس بتاتی ہے کہ ہمارے تمام اعمال، خواہ وہ اندھیرے میں کئے گئے ہوں یا اجالے میں، تنہائی میں ان کا ارتکاب ہوا ہو یا مجمع کے اندر، سب کے سب فضا میں تصویری حالت میں موجود ہیں، اور کسی بھی وقت ان کو یکجا کر کے ہر شخص کا پورا کارنامۂ حیات معلوم کیا جا سکتا ہے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، ٹھہری ہوئی ہو یا حرکت کر رہی ہو، جہاں یا جس حالت میں ہو، اپنے اندر سے مسلسل حرارت

خارج کرتی رہتی ہے، یہ حرارت چیزوں کے ابعاد واشکال کے اعتبار سے اس طرح نکلتی ہے کہ وہ بعینہ اس چیز کا عکس ہوتی ہے، جس سے وہ نکلی ہے، جس طرح آواز کی لہریں اس مخصوص تھرتھراہٹ کا عکس ہوتی ہیں، جو کسی زبان پر جاری ہوئی تھی، چنانچہ ایسے کیمرے ایجاد کئے گئے ہیں، جو کسی چیز سے نکلی ہوئی حرارتی لہروں (Heat Waves) کو اخذ کر کے اس کی اس مخصوص حالت کا فوٹو تیار کر دیتے ہیں جبکہ وہ لہریں اس سے خارج ہوئی تھیں، مثلاً میں اس وقت ایک مسجد میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مگر یہاں اپنی موجودگی کے دوران میں نے جو حرارتی لہریں خارج کی ہیں، وہ بدستور موجود رہیں گی اور حرارت دیکھنے والی مشین کی مدد سے خالی شدہ مقام سے میرا مکمل فوٹو حاصل کیا جا سکتا ہے، البتہ اس وقت جو کیمرے بنے ہیں وہ چند گھنٹے بعد ہی تک کسی لہر کا فوٹو لے سکتے ہیں، اس کے بعد کی لہروں کا عکس اتارنے کی طاقت ان میں نہیں ہے۔

ان کیمروں میں انفرارڈ شعاعوں سے کام لیا جاتا ہے، اس لئے وہ اندھیرے اور اجالے میں یکساں فوٹو لے سکتی ہیں، امریکہ اور انگلینڈ میں اس دریافت سے کام لینا شروع ہو گیا ہے، چند سال پہلے کی بات ہے، ایک رات نیویارک کے اوپر ایک پُراسرار ہوائی جہاز چکر لگا کر چلا گیا، اس کے فوراً بعد مذکورہ بالا کیمرے کے ذریعہ فضا سے اس کی حرارتی تصویر لی گئی، اس کے مطالعہ کے بعد معلوم ہو گیا کہ اڑنے والا جہاز کس ساخت کا تھا، (ریڈر ڈائجسٹ، نومبر 1960ء) اس کیمرے کو مصور حرارت (Evaporagraph) کہتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے ہندستان ٹائمز نے لکھا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہم تاریخ کو پردۂ فلم کے اوپر دیکھ سکیں گے اور ہو سکتا ہے کہ پچھلے ادوار کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہوں جو ہماری موجودہ تاریخی نظریات کو بالکل بدل ڈالیں۔

یہ ایک حیرت انگیز دریافت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فلم اسٹوڈیو میں نہایت تیز رفتار کیمرے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تمام حرکات وسکنات کی تصویر لیتے رہتے

ہیں، اسی طرح عالمی پیمانے پر ہر شخص کی زندگی فلمائی جارہی ہے، آپ خواہ کسی کو تھپڑ ماریں یا کسی غریب کا بوجھ اٹھادیں، اچھے کام میں مصروف ہوں یا برے کام کے لئے دوڑ دھوپ کررہے ہوں، اندھیرے میں ہوں یا اجالے میں، جہاں اور جس حال میں ہوں، ہر وقت آپ کا تمام عمل کائنات کے پردہ پر نقش ہورہا ہے، آپ اسے روک نہیں سکتے، اور جس طرح فلم اسٹوڈیو میں دہرائی ہوئی کہانی کو اس کے بہت بعد اور اس سے بہت دور رک کر ایک شخص اسکرین پر اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ عین موقع واردات پر موجود ہو، ٹھیک اسی طرح ہر شخص نے جو کچھ کیا ہے اور جن واقعات کے درمیان اس نے زندگی گزاری ہے، اس کی پوری تصویر ایک روز اس کے سامنے اس طرح آسکتی ہے کہ اس کو دیکھ کر وہ پکار اٹھے:

مَالِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصَاهَا (الکھف:49)

ترجمہ: یہ کیسا دفتر ہے جس نے میرا چھوٹا بڑا کوئی کام بھی درج کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہر انسان کا مکمل اعمال نامہ تیار کیا جارہا ہے، جو خیال بھی آدمی کے دل میں گزرتا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتا ہے، اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ ہورہا ہے، ہر آدمی کے اردگرد ایسے کیمرے لگے ہوئے ہیں جو اندھیرے اور اجالے کی تمیز کئے بغیر شب وروز اس کا فلم تیار کررہے ہیں، گویا انسان کا قلبی عمل ہو یا لسانی عمل یا عضوی عمل، ہر ایک نہایت باقاعدگی کے ساتھ درج کیا جارہا ہے، اس حیرت انگیز صورت حال کی توجیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ خدا کہ عدالت میں ہر انسان کا جو مقدمہ پیش ہونے والا ہے، یہ سب اس کی شہادت فراہم کرنے کے انتظامات ہیں، جو خود عدالت کی طرف سے کئے گئے ہیں، کوئی بھی شخص ان واقعات کی اس سے زیادہ معقول توجیہ پیش نہیں کرسکتا، اب یہ صریح واقعہ بھی آدمی کو آخرت میں ہونے والی باز پرس کا یقین نہیں دلاتا، تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا واقعہ ہوگا جو اس کی آنکھ کھولے گا۔

تقاضا

اوپر ہم نے آخرت کے تصور پر اس حیثیت سے بحث کی ہے کہ موجودہ کائنات میں کیا اس قسم کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن ہے جس کا مذہب میں دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ آخرت قطعی طور پر ممکن الوقوع ہے، اب یہ دیکھئے کہ کیا ہماری دنیا کو اس قسم کی آخرت کی کوئی ضرورت بھی ہے، کیا کائنات اپنے موجودہ ڈھانچہ کے اعتبار سے تقاضا کرتی ہے کہ آخرت لازماً وقوع میں آئے؟

سب سے پہلے نفسیاتی پہلو کو لیجئے ___ تنگھم نے اپنی کتاب (Plato,s Apology) میں زندگی بعد موت کے عقیدے کو خوش کن لاادریت (Cheerful Agnosticism) کہا ہے، یہی موجودہ زمانے میں تمام بے خدا مفکرین کا نظریہ ہے، ان کا خیال ہے کہ دوسری زندگی کا عقیدہ انسان کی اس ذہنیت نے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے لئے ایک ایسی دنیا تلاش کرنا چاہتا ہے جہاں وہ موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور مشکلات سے آزاد ہوکر خوشی اور فراغت کی ایک دل پسند زندگی حاصل کر سکے، یہ عقیدہ انسان کی محض ایک مفروضہ خوش فہمی ہے، جس کے ذریعہ وہ اس خیالی تسکین میں مبتلا رہنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنی محبوب زندگی کو پالے گا، ورنہ جہاں تک حقیقت واقعہ کا تعلق ہے، ایسی کوئی دنیا واقعہ میں موجود نہیں ہے مگر انسان کی یہ طلب بذات خود آخرت کا ایک نفسیاتی ثبوت ہے، جس طرح پیاس کا لگنا پانی کی موجودگی اور پانی اور انسان کے درمیان ربط کا ایک داخلی ثبوت ہے، اسی طرح ایک بہتر دنیا کی طلب اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی ایک دنیا فی الواقع موجود ہے، اور ہم سے اس کا براہِ راست تعلق ہے تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے عالمگیر پیمانے پر یہ طلب انسان کے اندر موجود رہی ہے، اب یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ ایک بے حقیقت چیز اتنے بڑے پیمانے پر اور اس قدر ابدی شکل میں انسان کو متاثر کردے، ایک ایسا واقعہ جو ہمارے لئے

اس امکان کا قرینہ پیدا کرتا ہے کہ دوسری بہتر دنیا موجود ہونی چاہئے، خود اسی واقعہ کو فرضی قرار دینا صریح ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو لوگ اتنے بڑے نفسیاتی تقاضے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ غیر حقیقی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پھر اس زمین پر وہ کون سا واقعہ ہے جس کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں تو اس کے لئے ان کے پاس کیا دلیل ہے، یہ خیالات اگر صرف ماحول کا نتیجہ ہیں تو وہ انسانی جذبات کے ساتھ اتنی مطابقت کیوں رکھتے ہیں کیا دوسری کسی ایسی چیز کی مثال دی جا سکتی ہے، جو ہزاروں سال کے دوران میں اس قدر تسلسل کے ساتھ انسانی جذبات کے ساتھ اپنی مطابقت باقی رکھ سکی ہو، کیا کوئی بڑے سے بڑا قابل شخص یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ایک فرضی چیز گڑھے اور اس کو انسانی نفسیات میں اس طرح شامل کر دے، جس طرح یہ احساسات انسانی نفسیات میں سموئے ہوئے ہیں۔

انسان کی بہت سے تمنائیں ہیں، جو اس دنیا میں پوری نہیں ہوتیں، انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں صرف زندگی ہو، مگر اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے، جہاں زندگی کے ساتھ موت کا قانون بھی نافذ ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے علم، تجربہ اور جدو جہد کے نتیجہ میں جب اپنی کامیاب ترین زندگی کے آغاز کے قابل ہوتا ہے، اسی وقت اس کے لئے موت کا پیغام آجاتا ہے، لندن کے کامیاب تاجروں کے متعلق اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ 45۔65 سال کے عمر کے درمیان جب وہ اپنا کاروبار خوب جما لیتے ہیں، اور پانچ ہزار تا دس ہزار پونڈ (ایک لاکھ روپے سے زیادہ) سالانہ کما رہے ہوتے ہیں، اس وقت اچانک ایک روزان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، ونوڈ ریڈی (Winwood Reade) لکھتا ہے۔

”یہ ہمارے لئے ایک غور طلب مسئلہ ہے کہ کیا خدا سے ہمارا کوئی ذاتی رشتہ ہے، کیا اس دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے، جہاں ہمارے عمل کے مطابق ہم کو بدلہ دیا جائے

گا، یہ نہ صرف فلسفہ کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، بلکہ یہ خود ہمارے لئے سب سے بڑا عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے ہما امفاد بہت زیادہ وابستہ ہے، موجودہ زندگی بہت مختصر ہے، اوراس کی خوشیاں بہت معمولی ہیں، جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ، جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے، اگر یہ واضح ہوسکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہوسکتی ہے تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص اس طرح زندگی گزارنے سے انکار نہیں کرے گا۔''

Martyrdom of Man, P. 414

مگر یہی مصنف فطرت کی اتنی بڑی پکار کو محض ایک معمولی سے اشکال کی بنا پر رد کر دیتا ہے:

''یہ نظریہ اس وقت تک بظاہر بڑا معقول نظر آتا تھا، جب تک گہرائی کے ساتھ ہم نے اس کی تحقیق نہیں کی تھی ،مگر جب ایسا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ محض ایک لغو (Absurd) بات ہے، اوراس کی لغویت کو بآسانی ثابت کیا جاسکتا ہے ____ محروم العقل آدمی جو کہ اپنے گناہوں کا ذمہ دار نہیں ہے، وہ تو جنت میں جائے گا، مگر گوئٹے اور روسو جیسے لوگ جہنم میں جلیں گے! اس لئے محروم العقل پیدا ہونا اس سے اچھا ہے کہ آدمی گوئٹے اور روسو کی شکل میں پیدا ہو، اور یہ بات بالکل لغو ہے۔''

(ایضاً صفحہ 415)

یہ ویسی ہی بات ہے جیسے لارڈ کلون (Kelvin) نے میکس ویل Maxwell کی تحقیق کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، لارڈ کلون کا کہنا تھا کہ ''جب تک میں کسی چیز کا مشینی ماڈل Mechanical Model نہیں بنالیتا، میں اسے سمجھ نہیں سکتا۔'' اس بنا پر اس نے روشنی کے متعلق میکسویل کے برقی مقناطیسی نظریے کو قبول نہیں کیا، کیونکہ وہ اس کے مادی فریم میں نہیں آتی تھی، طبیعیات کی دنیا میں آج یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے، جے، ڈبلیو، این سولیون (Sullivan) کے الفاظ میں ____ ''ایک شخص کیوں ایسا خیال کرے کہ فطرت

کو ایک ایسی نوعیت کی چیز ہونا چاہئے جس کو انیسویں صدی کا ایک انجینئر اپنے کارخانہ میں ڈھال سکتا ہو'' [۱] یہی بات میں ونِ وڈ کے مندرجہ بالا اعتراض کے بارے میں کہوں گا، ــــــ ''بیسویں صدی کا یک فلسفی آخر یہ سمجھنے کا کیا حق رکھتا ہے کہ کہ خارجی دنیا کو اس کے اپنے مزعومات کو مطابق ہونا چاہئے۔''

مصنف کی سمجھ میں اتنی موٹی سی بات نہیں آئی کہ حقیقت واقعہ خارج کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود خارج حقیقت واقعہ کا محتاج ہوتا ہے، جب حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، اوراس کے سامنے حساب کتاب کے لئے ہمیں حاضر ہونا ہے تو پھر ہر شخص کو خواہ وہ روسو ہو یا ایک معمولی شہری، خدا کا وفادار بن کر زندگی گزارنی چاہئے، ہماری کامیابی حقیقت سے موافقت کرنے میں ہے نہ کہ اس کے خلاف چلنے میں، مصنف روسوؔ اور گوئٹےؔ سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنائیں بلکہ خود حقیقت واقعہ سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدل ڈالے، اور جب وہ اپنے اندر تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتی تو حقیقت واقعہ کو لغو قرار دیتا ہے، حالانکہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص جنگی راز کے تحفظ کے قانون کو اس بنا پر لغو قرار دے کہ اس کی رو سے بعض اوقات ایک معمولی سپاہی کا کام قابل تعریف قرار پاتا ہے، اور روزن برگ جیسے ممتاز سائنس داں اوراس کی نوجوان اور تعلیم یافتہ بیوی (RosenbergPair) کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر پھانسی دے دی جاتی ہے۔

ساری معلوم دنیا کے اندر صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے، یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے آئندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بہت سے جانور بھی ''کل'' کے لئے عمل کرتے ہیں، مثلاً چیونٹیاں گرمی کے موسم میں جاڑے کے لئے خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا اپنے آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کے لئے گھونسلا بناتا ہے، مگر جانوروں کا اس قسم کا عمل

---

(۱) The Limitation of Science, P.9

محض جبلّت کے تحت غیر شعوری طور پر ہوتا ہے، وہ ''کل'' کی ضرورتوں کو سوچ کر بالقصد ایسا نہیں کرتے ، بلکہ بلاارادہ طبعی طور پر انجام دیتے ہیں، اور بطور نتیجہ وہ اِن کے مستقبل میں انھیں کام آتا ہے ''کل'' کو ذہن میں رکھ کر اس کی خاطر سوچنے کے لئے تصوری فکر (Conceptual Thought) کی ضرورت ہے، اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کسی دوسرے جاندار کو تصوری فکر کی خصوصیت حاصل نہیں۔

انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ مواقع ملنے چاہئیں ،جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی ''کل'' نہیں رکھتے مگر انسان کا مطالعہ صاف طور پر بتا تا ہے کہ اس کے لئے ایک ''کل'' ہونا چاہئے، ایسا نہ ہونا نظام فطرت کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ زندگی میں ہماری ناکامیاں، عام طور پر، ہم کو اس سے بہتر ایک زندگی کی توقع کی طرف لے جاتی ہیں، ایک خوش حال فضا میں ایسا عقیدہ باقی نہیں رہ سکتا، روم کے غلام۔مثال کے طور پر بہت بڑی تعداد میں عیسائی ہو گئے، کیونکہ عیسائیت ان کو آسمان میں خوشی حاصل ہونے کی توقع دلاتی تھی، یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی سے انسان کی خوشی اور خوشحالی بڑھے گی، اور بالآخر دوسری زندگی کا تصور ختم ہو جائے گا۔

مگر سائنس اور ٹکنالوجی کی چارسو سالہ تاریخ اس کی تصدیق نہیں کرتی ،ٹکنالوجی کی ترقی نے سب سے پہلے دنیا کو جو چیز دی وہ یہ تھا کہ سرمایہ رکھنے والے محدود گروہ کو ایسے وسائل وذرائع ہاتھ آ گئے جس کے بل پر وہ چھوٹے کاریگروں اور پیشہ وروں کو ختم کر کے دولت کا تمام بہاؤ اپنی طرف کرلیں اور عام باشندوں کو محض اپنا محتاج مزدور بنا کر رکھ دیں، اس انجام کے ہولناک مناظر مارکس کی کتاب ''کیپٹل'' میں تفصیل کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں، جو گویا اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اس مزدور طبقہ کی چیخ ہے، جس کو مشینی نظام نے اپنے ابتدائی دور میں جنم دیا تھا، اس کے بعد ردعمل شروع ہوا اور مزدور تحریکوں کی ایک صدی کی

کوشش سے اب حالات بہت بدل چکے ہیں مگر یہ تبدیلی صرف ظاہر کی تبدیلی ہے، بیشک آج کا مزدور پہلے کے مزدور کے مقابلے میں زیادہ اجرت پاتا ہے، لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کی دولت کا تعلق ہے، اس معاملے میں وہ اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ محروم ہے ______

سائنس اور ٹکنالوجی نے جو نظام بنایا ہے، وہ کچھ مادی ظواہر انسان کو دے دے، مگر خوشی اور اطمینان قلب کی دولت پھر بھی اسے نہیں دیتا، تہذیب جدید کے انسان کے بارے میں بلیک (Black) کے الفاظ نہایت صحیح ہیں:۔

A Mark in every face I meet

Marks of weakness, marks of woe.

برٹرینڈرسل نے اعتراف کیا ہے کہ ''ہماری دنیا کے جانور خوش ہیں، انسانوں کو بھی خوش ہونا چاہئے، مگر جدید دنیا میں انھیں یہ نعمت حاصل نہیں۔''

Comquest of Happiness P. 11

بلکہ رسل کے الفاظ میں اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اس کا حصول ممکن ہی نہیں:۔

Happiness in the modren world

has become an inmossibility P.93

نیویارک جانے والا ایک سیاح ایک طرف تو اسٹیٹ بلڈنگ جیسی عمارتوں کو دیکھتا ہے جس کی 102 منزلیں ہیں، اور جو اتنی اونچی ہے کہ اس کا اوپر کا ٹمپریچر نیچے کے مقابلے میں کافی سرد ہو جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اتریں تو یہ مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ آپ اس پر گئے تھے، 1250 فٹ بلند عمارت پر چڑھنے میں لفٹ کے ذریعہ صرف تین منٹ لگتے ہیں، ان عالی شان عمارتوں کو دیکھ کر وہ کلب میں جاتا ہے، وہاں وہ دیکھتا ہے کہ عورت مرد سب مل مل کر خوب ناچ رہے ہیں۔ ''کتنے خوش نصیب ہیں یہ لوگ'' وہ سوچتا ہے، مگر زیادہ دیر گزرنے نہیں پاتی کہ اس جھنڈ میں سے ایک نوجوان عورت آکر اس کے پاس کی نشست پر بیٹھ جاتی

ہے، وہ بہت افسردہ ہے۔

''سیاح! کیا میں بہت بدصورت ہوں'' عورت کہتی ہے۔

''میرا خیال تو ایسا نہیں ہے۔''

''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں رعنائی Glamour نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں تو تم میں گلے مرہے۔''

''شکریہ۔ لیکن اب نہ مجھے نوجوان ٹیپ (Tap) کرتے ہیں، اور نہ ڈیٹ (Date) مانگتے ہیں، مجھے زندگی ویران نظر آنے لگی ہے۔''

یہ جدید دور کے انسان کی ایک ہلکی سی جھلک ہے، حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے صرف مکانوں کو ترقی دی ہے، اس نے مکینوں کے دل کا سکون چھین لیا ہے، اس نے شاندار مشینیں کھڑی کی ہیں، مگر ان مشینوں میں کام کرنے والے انسانوں کو چین سے محروم کردیا ہے، یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی 4 سو سالہ تاریخ کا آخری انجام ہے، پھر کس بنیاد پر یقین کرلیا جائے کہ سائنس اور ٹکنالوجی وہ سکون اور مسرت کی دنیا بنانے میں کامیاب ہوگی جس کی انسان کو تلاش ہے۔

2۔ اب اخلاقی تقاضے کو لیجئے، اس حیثیت سے جب ہم دیکھتے ہیں تو دنیا کے حالات شدید طور پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس کی ایک آخرت ہو، اس کے بغیر ساری تاریخ بالکل بے معنی ہوتی ہے۔

یہ ہمارا ایک فطری احساس ہے کہ ہم خیر اور شر ظلم اور انصاف میں تمیز کرتے ہیں، انسان کے سوا کسی بھی مخلوق کے اندر یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی، مگر انسان ہی کی دنیا وہ دنیا ہے، جہاں اس احساس کو سب سے زیادہ پامال کیا جارہا ہے، انسان اپنے ابنائے نوع پر ظلم کرتا ہے، وہ اس کو لوٹتا ہے، اس کو قتل کرتا ہے، اور طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتا ہے، حالانکہ جانوروں تک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی نوع کے ساتھ سفاکی نہیں کرتے، بھیڑیے اور

شیر اپنی نوع کے لئے بھیڑیے اور شیر نہیں ہیں، مگر انسان خود انسان کے لئے بھیڑیا بنا ہوا ہے، بیشک انسانی تاریخ میں حق شناسی کی چنگاریاں ملتی ہیں، اور وہ بہت قابل قدر ہیں، مگر اس کا بڑا حصّہ حق تلفی کی روداد سے بھرا ہوا ہے، مورخ کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ انسان کا ضمیر جو کچھ چاہتا ہے، دنیا کے واقعی حالات اس کے خلاف ہیں، یہاں میں چند اقوال نقل کروں گا۔

والٹیر:۔"انسانی تاریخ محض جرائم اور مصائب کی ایک تصویر ہے۔"(۱)

ہربرٹ اسپنسر:۔"تاریخ محض بے فائدہ گپ ہے۔"

نپولین:۔"تاریخ تمام کی تمام لایعنی قصّے کا نام ہے۔"

اڈورڈ گبن:۔"انسانیت کی تاریخ جرائم، حماقت اور بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے۔"

ہیگل:۔"پبلک اور حکومت نے تاریخ کے مطالعہ سے جو واحد چیز سیکھی ہے، وہ صرف یہ کہ انھوں نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔"

Western Civilisation by Edward McNall Burns, P.871

کیا انسانیت کا یہ عظیم الشان ڈراما اسی لئے کھیلا گیا تھا کہ وہ اس طرح کی ایک ہولناک کہانی وجود میں لاکر ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے، ہماری فطرت جواب دیتی ہے کہ نہیں، انسان کے اندر عدل وانصاف کا احساس تقاضا کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا، اور نہ ایسا ہونا چاہئے، ایک دن ایسا آنا ضروری ہے، جب حق اور ناحق الگ ہو، ظالم کو اس کے ظلم کا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ ملے، یہ ایک ایسی طلب ہے، جس کو اسی طرح تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا جس طرح اسے انسان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

فطرت اور واقعہ کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اس خلا کو لازماً پر ہونا چاہئے ______ جو کچھ ہو رہا

---

(۱) Story of Philosophy by Will durant, P. 220

ہے، اور جو کچھ ہونا چاہئے، دونوں کا فرق ثابت کرتا ہے کہ ابھی زندگی کے ظہور کا کوئی اور اسٹیج باقی ہے، یہ خلا پکار رہا ہے کہ ایک وقت ایسا نہیں ہونا چاہئے جب دنیا کی تکمیل ہو، مجھے حیرت ہے کہ لوگ ہارڈی کی فلسفہ پر ایمان لاکر دنیا کو ظلم اور بے رحمی کی جگہ سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہی ظالمانہ صورتِ حال انھیں اس یقین کی طرف نہیں لے جاتی کہ جو کچھ آج موجود نہیں ہے، مگر عقل جس کا تقاضا کرتی ہے، اسے کل وقوع میں آنا چاہئے۔

''قیامت نہ ہوتو ان ظالموں کا سر کون توڑے'' ______ یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ اس وقت میری زبان سے نکل جاتا ہے، جب میں اخبار پڑھتا ہوں، اخبار گویا دنیا کے روزانہ حالات کی ایک تصویر ہے، مگر اخبار ہمیں دنیا کے حالات کے بارے میں کیا بتاتے ہیں، وہ اغوا اور قتل کی خبریں دیتے ہیں، چوری اور الزام تراشی کی داستانیں سناتے ہیں، سیاسی تجارت اور تاجرانہ سیاست کے جھوٹے پروپیگنڈے ہمارے دماغوں میں بھرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ فلاں حکمراں نے اپنے ماتحت کمزوروں کو دبالیا، فلاں قوم نے قومی مفاد کے لئے فلاں علاقے پر قبضہ کرلیا، غرض اخبار، درویش اور سلطان کی عیاریوں کی داستان کے سوا اور کچھ نہیں، اور مستقبل قریب میں ہندستان میں ہونے والے حادثات خاص طور پر جبل پور، کلکتہ، جمشید پور اور راور کیلا کی قتل وغارت گری کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کسی بھی قابل قیاس یا ناقابل قیاس بدترین برائی کو ناممکن نہیں سمجھنا چاہئے ، ایک قوم سیکولرزم، جمہوریت اور اہنسا کی علمبردار بن کر وحشیانہ فرقہ واریت سفاکانہ آمریت اور بدترین تشدد کا ارتکاب کرسکتی ، ایک لیڈر جس کو محسن انسانیت اور پیغمبر امن واماں کا خطاب دیا گیا ہو عین اس کے اقتدار میں انسانیت کے اوپر ایسے شرمناک مظالم کئے جاسکتے ہیں، جن کے ایک بہت بڑے ملک میں بہت بڑے پیمانے پر کھلم کھلا ایک گروہ کو لوٹنے، جلانے اور قتل کرنے کے انتہائی بھیانک واقعات نہایت منظم طریقے پر ہوں اور مہینوں اور سالوں ہوتے رہیں، مگر اس کے باوجود دنیا کا پریس ان سے بے خبر ہوا اور تاریخ کے صفحات سے وہ

اس طرح محو ہو جائیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں ـــــــ کیا یہ دنیا اسی لئے بنائی گئی تھی کہ مکاری، شیطنت، درندگی اور ڈاکہ زنی کے ان ہولناک ڈراموں کا بس ایک اسٹیج بن کر رہ جائے اور اس کے بعد نہ ظالم کے لئے کچھ ہو اور نہ مظلوم کے لئے کچھ ـــــــ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی دنیا خود اپنے سارے وجود کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ نامکمل ہے، اور اس کا نامکمل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک وقت آنا چاہئے جب وہ مکمل کی جائے۔

اس بات کو ایک اور پہلو سے دیکھئے، قدیم ترین زمانے سے انسان کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ لوگوں کو حق وصداقت کی راہ پر کیسے قائم رکھا جائے، اگر اس مقصد کے لئے تمام افراد کے مقابلے میں کچھ لوگوں کو سیاسی اختیار دیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ ان کے ماتحت ان کی گرفت کے خوف سے زیادتیاں نہ کریں ـــــــ مگر اس تدبیر میں خود ان صاحب اختیار افراد کو عدل پر قائم رکھنے کا کوئی محرک موجود نہیں ہے، اگر اس مقصد کے لئے قانون بنایا جائے اور پولیس کا محکمہ قائم ہو تو ان مقامات اور مواقع پر آدمی کو کون کنٹرول کرے جہاں پولیس اور قانون نہیں پہونچتے اور نہیں پہونچ سکتے، اگر اپیل اور پروپیگنڈے کی مہم چلائی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض کسی کی اپیل کی بنا پر کوئی شخص اپنے ملتے فائدے کو کیوں چھوڑ دے گا، دنیا کی سزا کا خوف بدعنوانیوں کو ہرگز روک نہیں سکتا، کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ جھوٹ، رشوت، سفارش، اثرات کا ناجائز استعمال اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے ذرائع موجود ہیں جو سزا کے ہر امکان کو یقینی طور پر ختم کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا محرک ہی بدعنوانیوں کو روکنے میں کارگر ہوسکتا ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہو، جو انسان کے اپنے ارادے میں شامل ہو جائے خارجی محرک کبھی اس معاملے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، اور یہ بات صرف آخرت کے تصور میں ممکن ہے، آخرت کے نظریے میں ایسا محرک موجود ہے جو بدعنوانیوں سے بچنے کے مسئلے کو ہر شخص کا اپنا مسئلہ بنا دیتا ہے، وہ ہر شخص کے لئے یکساں اہمیت رکھتا ہے، خواہ وہ ماتحت ہو یا افسر، اندھیرے

میں ہو یا اجالے میں، ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے خدا کے یہاں جانا ہے، اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے، اور اس سے لازماً باز پرس کرے گا، مذہبی عقیدے کی اسی اہمیت کی بنا پر سترھویں صدی کے آخر کے ایک نامور جج میتھو ہیل (Mathew Halos) نے کہا ہے:۔

"یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرنا ہے جن سے سماجی نظم کو برقرار رکھا جاتا ہے۔"

Religion Without Revelation, P.115

نظریۂ آخرت کا یہ پہلو کتنا اہم ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بہت سے لوگ جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، جو اس بات کو بطور ایک حقیقت واقعہ نہیں مانتے کہ کوئی فیصلہ کا دن آنے والا ہے، وہ بھی تاریخ کے تجربے کی بنا پر ماننے پر مجبور ہوئے ہیں، کہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، جو انسان کو قابو میں رکھ سکتی ہو اور ہر حال میں اس کو عدل وانصاف کی روش پر قائم رہنے کے لئے مجبور کر سکے، مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے خدا کے تصور کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ اس کی موجودگی کا کوئی تسلی بخش ثبوت ہم کو نہیں ملتا، اس کے نزدیک نظری معقولیت (Theoretical Reason) تو یقیناً مذہب کے حق میں نہیں ہے، مگر اخلاقی پہلو سے مذہب کی عملی معقولیت (Practical Reason) کو وہ تسلیم کرتا ہے، [1] والٹیر (Voltaie) کسی مابعد الطبیعی حقیقت کو نہیں مانتا، مگر اس کے نزدیک:

"خدا اور دوسری زندگی کے تصور کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے لئے مفروضے (Postulates of the Moral Feeling) کا کام دیتے ہیں، اس کے نزدیک صرف اسی کے ذریعہ سے بہتر اخلاق کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے، اگر یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو حسن عمل کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہتا،

---

(۱) Story of Philosophy, N.Y. 1954.P .279

اوراس طرح سماجی نظم کا برقرار رہنا ناممکن ہوجاتا ہے۔‘‘

(History of Philosophy by Windelband, P.496

جولوگ آخرت کوایک فرضی تصور کہتے ہیں، ان کوسوچنا چاہئے کہ آخرت اگرفرضی ہے تو ہمارے لئے اس قدرضروری کیوں ہے، کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم صحیح معنوں میں کوئی سماجی نظام بنا ہی نہیں سکتے، انسانی ذہن سے اس تصورکونکالنے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہوجاتی ہے، کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لئے اس قدرناگزیر ہوسکتی ہے، کیااس کائنات میں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے، کہ ایک چیز حقیقت میں موجود نہ ہومگراس کے باوجودوہ اس قدر حقیقی بن جائے ،زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو،مگراس کے باوجودوہ زندگی سے اتنی متعلق نظرآئے ،زندگی کی صحیح اورمنصفانہ تنظیم کے لئے آخرت کےتصورکااس قدرضروری ہونا خود یہ ظاہرکرتاہے کہ آخرت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے، بلکہ اگرمیں یہ کہوں تواس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ تصورآخرت کےحق میں استدلال کا یہ ایک ایسا پہلو ہے، جواس نظریےکولیبارٹری ٹسٹ کےمعیار پرصحیح ثابت کررہاہے۔

3۔اب ایک اور پہلو سے دیکھئےجس کومیں ’’کائناتی تقاضا‘‘ کہتاہوں،پچھلے باب میں میں نے کائنات میں خداکے وجود پر بحث کی ہے،اس سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ عین علمی اورعقلی مطالعہ ہی کا یہ تقاضاہے کہ ہم اس کائنات کاایک خدامانیں ،اب اگراس دنیا کاکوئی خداہےتویقیناً بندوں کے ساتھ اس کےتعلق کوظاہر ہونا چاہئے ،یہ کب ظاہر ہوگا، جہاں تک موجودہ دنیا کا معاملہ ہے،یقین کے ساتھ کہاجاسکتاہے، کہ آج یہ تعلق ظاہرنہیں ہورہاہے،آج جوشخص خداکامنکرہے،اورکھلے عام یہ اعلان کرتاہے کہ ’’میں خداسے نہیں ڈرتا‘‘ اس کولیڈری اورحکومت حاصل ہوجاتی ہے،اس کے برعکس جوخداکے بندے خدا کا کام کرنے کے لئے اٹھتے ہیں،ان کی سرگرمیوں کووقت کااقتدارغیرقانونی قراردے دیتا ہے، جولوگ خداکامذاق اڑاتے ہیں اورکہتے ہیں کہ ’’ہماراراکٹ چاندتک گیااورراستہ میں

اس کو کہیں خدا نہیں ملا'' ان کے نظریات کو پھیلانے کے لئے بے شمار ادارے کام کر رہے ہیں، اور پورے پورے ملکوں کے ذرائع و وسائل ان کی خدمت کے لئے وقف ہیں، اور جو لوگ خدا اور مذہب کی بات پیش کر رہے ہیں، ان کو تمام ماہرین اور علمائے وقت رجعت پسند اور ماضی کے اندھیرے میں بھٹکنے والا کہہ کر رد کر دیتے ہیں، لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، انقلاب آتے ہیں، اور چلے جاتے ہین، سورج نکلتا ہے، اور ڈوب جاتا ہے، مگر خدا کی خدائی کا کہیں ظہور نہیں ہوتا، ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں یا نہیں، اگر ہم خدا کو مانتے ہیں تو ہمیں آخرت کو بھی ماننا پڑے گا، کیونکہ خدا اور بندوں کا تعلق ظاہر ہونے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔

ڈارون اس دنیا کا ایک خالق (Creator) تسلیم کرتا ہے، مگر اس نے زندگی کی جو تشریح کی ہے، اس کے اندر خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور نہ کائنات کے کسی ایسے انجام کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، جہاں یہ تعلق ظاہر ہو، مجھے نہیں معلوم کہ ڈارون اپنے حیاتیاتی نقطۂ نظر کے اس خلا کو کیسے پُر کرے گا مگر میری عقل کو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا تو ہو مگر دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور بندوں کے مقابلے میں اس کی جو مالکانہ حیثیت ہے وہ کبھی سامنے نہ آئے، اتنی بڑی کائنات پیدا ہو کر ختم ہو جائے، اور یہ ظاہر نہ ہو کہ اس کے وجود میں آنے کا مقصد کیا تھا، اور جس نے اسے بنایا تھا، وہ کس قسم کی صفات رکھنے والی ہستی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر معقولیت کے ساتھ غور کیا جائے گا تو دل پکار اٹھے گا کہ بے شک آخرت آنے والی ہے، بلکہ وہ آپ کو بالکل آتی ہوئی نظر آئے گی، آپ دیکھیں گے کہ حاملہ کے پیٹ میں جس طرح اس کا حمل باہر آنے کے لئے بیتاب ہو، اسی طرح وہ کائنات کے اندر بوجھل ہو رہی ہے، اور قریب ہے کہ کسی بھی صبح و شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا

لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ط ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ط (الاعراف:۱۸۷)

ترجمہ: یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت، کہو اس کا علم تو صرف خدا کو ہے، وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا، وہ زمین و آسمان میں بوجھل ہو رہی ہے وہ بالکل اچانک تم پر آ پڑے گی۔

تجرباتی شہادت

اب ہم اس بحث کے آخری جزو پر آتے ہیں ''کیا کوئی تجرباتی شہادت اس بات کی موجود ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے'' اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری زندگی خود اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے، جو لوگ دوسری زندگی کے منکر ہیں، وہ یقینی طور پر پہلی زندگی کا اقرار کر رہے ہیں، پھر جو زندگی ایک بار ممکن ہے، وہ دوسری بار کیوں ظہور میں نہیں آسکتی، ایک تجربہ جس سے آج ہم دوچار ہیں، وہی تجربہ اگر دوبارہ ہمارے ساتھ پیش آئے تو اس میں استحالہ کی کون سی بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں اس سے زیادہ خلاف عقل بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ایک واقعہ کو آپ حال میں تسلیم کریں مگر مستقبل کے لئے اسی واقعہ کا انکار کردیں۔

یہ موجودہ انسان کا عجیب تضاد ہے کہ کائنات کی توجیہہ کے لئے خود اس نے جو ''خدا گڑھے ہیں، ان کے بارے میں تو وہ پورے یقین کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ پیدا کرسکتے ہیں، مگر مذہب جس خدا کا تصور پیش کرتا ہے، اس کے متعلق اسے یہ تسلیم نہیں ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ وجود میں لے آئے گا، جیمز جینز یہ بتاتے ہوئے کہ موجودہ زمین اور اس کے تمام مظاہر ایک ''حادثہ'' کے پیدا کردہ ہیں، اس نظریے کے حامیوں کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

''اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اگر ہماری زمین محض کچھ حادثات کے نتیجے میں وجود میں آئی ہو، اگر کائنات اسی طرح لمبی مدت تک قائم رہے تو کسی بھی قابل قیاس حادثے

کا وقوع میں آنا ممکن ہے۔''

Modren Scientific Thought, p.3

نظریۂ ارتقا کا دعویٰ ہے کہ حیوانات کی مختلف نوعیں ایک ہی ابتدائی نوع سے ترقی کر کے وجود میں آئی ہیں، چنانچہ ڈارون کی تشریح کے مطابق موجودہ زرافہ ابتداءً دوسرے سم دار چوپایوں کی مانند تھا، مگر توالد وتناسل کے طویل عمل کے درمیان چھوٹی چھوٹی تبدیلوں Varitions کے جمع ہونے سے بالآخر وہ غیر معمولی طور پر ایک لمبا ڈھانچہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب کے ساتویں باب میں لکھتا ہے:

''میرے نزدیک یہ تقریباً یقینی ہے کہ (اگر لمبی مدت تک مطلوبہ عمل جاری رہے تو)) ایک معمولی سم دار چوپائے کو زرافہ کی صورت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔''

Origin of Species, p.169

اسی طرح جس نے بھی زندگی اور کائنات کی کوئی توجیہہ کی ہے، بالکل فطری طور پر اس کو یہ بھی ماننا پڑا ہے کہ جن حالات کی موجودگی کو وہ زندگی اور کائنات کا سبب قرار دیتا ہے، وہی حالات اگر دوبارہ فراہم ہوسکیں تو یقیناً یہی واقعات دوبارہ وجود میں آسکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عقلی طور پر دوسری زندگی کا امکان اتنا ہی ہے جتنا پہلی زندگی کا، کائنات کا جو خالق بھی ہم تسلیم کریں، ہم کو ماننا پڑے گا کہ وہ خالق انھیں واقعات کو دوبارہ وجود میں لاسکتا ہے، جس کو اس نے ایک بار پیدا کیا ہے، اس اعتراف سے ہم صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہیں، جبکہ ہم پہلی زندگی کا انکار کردیں، پہلی زندگی کو مان لینے کے بعد ہمارے پاس دوسری زندگی کو نہ ماننے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

2۔نفسیاتی تحقیق، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کے مطابق لاشعور یا دوسرے لفظوں میں انسان کے حافظہ کے خانے میں اس کے تمام خیالات ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتے ہیں، یہ واقعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسان کا ذہن اس کے جسم کا حصہ نہیں ہے، جسم کا یہ

حال ہے کہ اس کے ذرات ہر چند سال بعد بالکل بدل جاتے ہیں، لیکن لاشعور کے دفتر میں سو برس بعد بھی کوئی تغیر، کوئی دھندلا پن، کوئی مغالطہ یا شبہ پیدا نہیں ہوتا، اگر یہ دفتر حافظہ جسم سے متعلق ہے تو وہ کہاں رہتا ہے، جسم کے کس حصّے میں ہے، اور جسم کے ذرات جب چند سال بعد غائب ہوجاتے ہیں تو وہ غائب کیوں نہیں ہوتا، یہ کون سا ریکارڈ ہے، کہ ریکارڈ کی تختی ٹوٹ کر ختم ہوجاتی ہے، مگر وہ ختم نہیں ہوتا، جدید نفسیات کا یہ مطالعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسانی وجود حقیقتاً اس جسم کا نام نہیں ہے، جس پر گھساؤ اور موت کا عمل طاری ہوتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک اور چیز ہے، جس کے لئے فنا نہیں ہے، اور جو زوال میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے وجود کو مستقل طور پر یکساں حال میں باقی رکھتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فاصلہ اور وقت کے قوانین صرف ہماری موجودہ دنیا کے اندر رائج ہیں، اور اگر موت کے بعد کوئی اور دنیا ہے تو وہ ان قوانین کے دائرۂ عمل سے باہر ہے، موجودہ زندگی میں ہمارا ہر شعوری فعل وقت اور فاصلہ کے قوانین کے مطابق سرزد ہوتا ہے، لیکن اگر فرائڈ کے نظریے کے مطابق ہماری کوئی ذہنی زندگی ایسی ہے جو ان قوانین کی پابندی سے آزاد ہے تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ ہماری یہ زندگی موت کے بعد بھی جاری رہے گی، ہم موت کے بعد بھی زندہ رہیں گے، ہماری موت خود فاصلہ اور وقت کے قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے، چونکہ ہماری اصل ہستی یا فرائڈ کے الفاظ میں ہمارا لاشعور ان قوانین کے عمل سے آزاد ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ موت اس پر وارد نہیں ہوتی، بلکہ صرف جسدِ عنصری پر وارد ہوتی ہے، لاشعور جو اصل انسان ہے، وہ اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے ــــــــ مثلاً ایک واقعہ جو 25 سال پہلے گزرا تھا ــــــــ یا ایک خیال جو میرے ذہن میں 20 سال پہلے آیا تھا، اور اب میں اسے بالکل بھول چکا تھا، اس کو آج میں خواب میں دیکھتا ہوں، نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے حافظہ (لاشعور) کے خانے میں بجنسہ موجود تھا، اب سوال یہ ہے کہ یہ حافظہ کہاں ہے، اگر وہ خلیوں کے اوپر ثبت

تھا، جیسے گراموفون کے ریکارڈ کے اوپر ثبت رہتی ہے، تو وہ خلیے جو 25 سال پہلے ان خیالات کا ریکارڈ بنے تھے، وہ بہت پہلے ٹوٹ کر اور مردہ ہو کر میرے جسم سے نکل گئے، اب نہ ان خلیوں کا بحیثیت خلیہ کہیں وجود ہے، اور نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے، پھر یہ خیال میرے جسم کے کس مقام پر تھا، یہ ایک تجرباتی شہادت اس بات کی ہے کہ جسم کے ماورا ایک اور دنیا ہے، جو بذات خود اپنا وجود رکھتی ہے، جو جسم کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہوتی۔

3۔اسی طرح سائی کیکل تحقیقات (Psyshical Research) کے نتائج جو سامنے آئے ہیں، وہ بھی خالص تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر موت کے بعد زندگی کے وجود کو ثابت کرتے ہیں، اس میں ہمارے نقطۂ نظر سے مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ بقائے محض کو ثابت نہیں کرتے، بلکہ عین اس شخصیت کی بقا کو ثابت کرتے ہیں، جس سے ہم موت سے پہلے واقف تھے۔

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذاتِ خود تو پہلے سے موجود تھیں مگر ان پر سائنسی انداز سے غور و فکر نہیں ہوا تھا، مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے، مگر جدید دور میں خواب کے مطالعہ سے جو نفسیاتی حقائق معلوم کئے گئے ہیں، ان سے قدیم دور کے لوگ ناآشنا تھے، اسی طرح کچھ اور مظاہر ہیں، جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعداد شمار جمع کئے گئے اور سائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا، اس طرح جدید مطالعہ کے ذریعہ ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں، اسی میں سے ایک سائی کیکل ریسرچ ہے، جو جدید نفسیات کی ایک شاخ ہے، اور جس کا مقصد انسان کی مافوق العادت صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے، اس قسم کی تحقیقات کے لئے سب سے پہلا ادارہ 1882ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور 1889ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کر کے وسیع پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کر دیں، یہ اب بھی مطالعۂ نفسیات کا ادارہ (Society for Psychical Research) کے نام سے موجود ہے، اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے

دوسرے ملکوں میں کام کررہے ہیں، ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پراسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکہ) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آڈر نوٹ کررہا تھا کہ ''یکا یک'' وہ لکھتا ہے ''مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے، میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو صاف طور پر مجھے نظر آیا کہ وہ میری بہن ہے'' اس کی یہ بہن 9 سال پہلے مرچکی تھی، کچھ دیر بعد بہن کا یہ پیکر اس کے سامنے سے غائب ہوگیا۔ مگر اس واقعہ سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کے بجائے وہ دوسری ٹرین سے اپنے وطن سینٹ لوئی (St.Louis) واپس ہوگیا، گھر آکر اس نے واقعہ کی پوری تفصیل اپنے اعزہ کو بتائی، جب وہ کہتے کہتے اس جملہ پر پہنچا کہ ''میں نے بہن کے چہرے کے دائیں طرف سرخ رنگ کی ایک روشن خراش دیکھی'' تو اس کی ماں یکا یک کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور اس نے بتایا کہ لڑکی کی موت کے بعد ایک اتفاقی سبب سے مجھ سے یہ خراش اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی، اس بدنمائی کا مجھے سخت احساس ہوا، اور فوراً پاؤڈر لگا کر میں نے خراش کے تمام آثار اس کے چہرے سے مٹا دیئے اور پھر کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔''(۱)

Human Personality and its survival of podily Death,
by F.W.H. Myers (N.Y.1930, vol llP.27-30)

---

(۱) اس طرح کے واقعات محض یورپ اور امریکہ کی خصوصیات نہیں ہیں، بلکہ دنیا کی ہر آبادی میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں چونکہ موجودہ زمانے کی بیشتر تحقیقات یورپ اور امریکہ ہی کے جغرافیہ میں ہوئی ہیں، اس لئے علمی شہادتوں کے سلسلے میں عموماً انھیں کا ذکر آتا ہے، اگر کچھ باحوصلہ لوگ ہمارے علاقے میں اس کام کو شروع کریں تو کثرت سے نہایت معتبر اور قوی شہادتیں فراہم ہوسکتی ہیں، مجھے ذاتی طور پر خود بھی بعض ایسے واقعات کا علم ہے جو اس سلسلے میں نہایت حیرت انگیز شہادت فراہم کرتے ہیں ___ افسوس کہ ہماری قوم میں نہ تو کسی کو اس طرح کے کاموں میں سرمایہ لگانے کا جذبہ ہے اور نہ اپنا وقت دینے کا۔

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں، جو مرنے کے بعد شخصیتوں کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اس طرح کے واقعات کو وہم وخیال نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ چہرے کی خراش کا علم یا تو ماں کو تھا یا مردہ لڑکی کو، تیسرا کوئی بھی شخص اس کو قطعاً نہیں جانتا تھا۔

دوسرے قسم کے واقعات جو زندگی بعد موت کا تجرباتی ثبوت فراہم کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں، جن کو خودکار (Automatists) کہا جاتا ہے، یہ وہ مرد یا عورتیں ہیں، جن سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں، کہ کسی مرنے والے کی روح اس کے اندر رہتی ہے، ایسا شخص اپنے تجربہ کرنے والے کے سامنے چند ایسے جزئی واقعات پیش کرتا ہے، جن کو صرف ایک مرا ہوا آدمی جانتا ہے، اور جو چند دن بعد صحیح ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح مثلاً دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص سے بات کر رہا ہے، اور اسی کے ہاتھ میں پنسل لئے ہوئے بالکل دوسرے موضوع پر لکھ رہا ہے، جس کے مضمون کی اسے خود بھی اس وقت تک اطلاع نہیں ہوتی جب تک کہ وہ لکھنے کے بعد اسے پڑھ نہ لے، گویا اس کے اندر اس کے سوا کوئی اور شخصیت ہے، جو اس کے ہاتھ سے لکھوا رہی ہے۔

A Philosophical Scrutiny of Religion, p.407-10

اس استدلال کو قبول کرنے میں بہت سے جدید ذہنوں کو تامل ہے، سی ڈی،، براڈ (C.D. Broad) لکھتا ہے۔

''سائی کیکل ریسرچ کے مشتبہ استثناء کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں سے کوئی شاخ زندگی بعد موت کا ادنیٰ امکان بھی ثابت نہیں کرتی۔''

Religion Philosophy and Psychical Research

London 1953, p.235

اگر یہ استدلال ایسا ہی ہے، جیسے کہا جائے کہ ''سوچنا'' ایک مشتبہ فعل ہے، کیونکہ انسان کے سوا کوئی ایسا وجود اس کائنات میں ہمارے تجربے میں نہیں آیا جو ''سوچنے'' کے مظہر کی

تصدیق کرتا ہو، ظاہر ہے کہ زندگی کا باقی رہنا یا باقی نہ رہنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے، اس لئے نفسیات ہی سے اس کا ثبوت یا عدم ثبوت ملے گا، کسی اور سائنس میں اس کی تصدیق ڈھونڈنا ایسا ہی ہے، جیسے سوچنے کے فطری مظہر کو سمجھنے کے لئے نباتات اور فلزیات سے تصدیق طلب کی جائے ، یہی نہیں بلکہ خود انسان کے جسمانی حصّے کے مطالعہ کو بھی اس کی تصدیق یا تردید کے لئے بنیاد بنایا نہیں جا سکتا کیونکہ جس چیز کی بقا کا یہ دعویٰ کیا گیا ہے، وہ موجودہ مادی جسم نہیں، بلکہ وہ روح ہے، جو جسم سے ماسوا جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ دوسرے بہت سے علماء جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، راؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر، سی، جے، ڈوکاس (C.J.Ducasse) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے، پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے، مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کر کے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا پڑتا ہے، اس باب کے آخری حصے میں وہ سائی کیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں۔

"کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں، جن میں صرف بقائے روح کا فریضہ Survival hypothesis ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے، ان کی دوسری کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی، اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

الفرڈ رسل ویلس (Alfred Rusel Wallace)

سر ولیم کروکس (Sir William Crookes)

ایف، ڈبلیو، ایچ، میرس (F.M.H. Myers)

کیسرلومبراسو(Cesare Lombroso)

کیمل فلیمیرین(Camille Flammarion)

سراولیورلاج(Sir Oliver Lodge)

ڈاکٹررچرڈہاگسن(Dr.Richard Hodgson)

مسزہنری سڈوک(Mrs Henry Sidgwick)

پروفیسرہسلوپ(Professor Hyslop)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں، نہ صرف یہ کہ صحیح ہوسکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے، جس کو تجرباتی دلیل (Empirical Proof) سے ثابت کیا جا سکتا ہے، اور اگر ایسا ہے تو قطع نظر اس من گڑھت کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کر لی ہے، قطعی معلومات بالآخر اس کے بارے میں حاصل ہوسکیں گی، مگر ایسی صورت میں اس کی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔"

A Philosophical Scrutiny of Religion,p.412

یہاں تک پہنچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلقین مذہبی عقیدے کو نہ ماننا ایسا ہی ہے، جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کریں، اس کے بعد اس کے ایک عزیز کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کر کے رسیور اس کے کان پر لگا دیا جائے، مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے ــــــ "کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو ممکن ہے، کوئی مشین بول رہی ہو۔"

اثباتِ رسالت

خدا کے بعد مذہب کا دوسرا اہم عقیدہ رسالت یا وحی والہام ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ خدا انسانوں میں سے کسی انسان پر اپنا کلام اتارتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے تمام انسانوں کو اپنی مرضی سے باخبر کرتا ہے، اب چونکہ بظاہر ہمیں خدا اور صاحب وحی کے درمیان ایسا کوئی ''تار'' نظر نہیں آتا جس پر خدا کا پیغام سفر کر کے انسانوں تک پہونچتا ہو، اس لئے بہت سے لوگ اس دعوے کے صحیح ہونے سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے، جس کو ہم اپنے معلوم حقائق کی مدد سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے گرد وپیش ایسے واقعات موجود ہیں، جو ہمارے محدود دائرہ سماعت سے کہیں بالاتر ہیں، مگر اس کے باوجود انھیں اخذ کیا جاسکتا ہے، انسان نے آج ایسے آلات ایجاد کر لئے ہیں، جن سے وہ ایک مکھی کے چلنے کی آواز میلوں دور سے اس طرح سن سکتا ہے، جیسے وہ اس کے کان کے پردہ پر رینگ رہی ہو، حتیٰ کہ وہ کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) کے تصادم تک کو ریکارڈ کر لیتا ہے، اس طرح کے آلات اب کثرت سے انسان کو حاصل ہو چکے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اخذ وسماعت کی ایسی صورتیں بھی ممکن ہیں جو معمولی حواس کے ذریعے ایک شخص کے لئے ناممکن اور ناقابل قیاس ہوں۔

پھر یہ مخصوص ذرائع ادراک صرف مشینی آلات تک محدود نہیں، بلکہ حیوانوں کا مطالعہ بتاتا ہے، کہ فطرت نے خود ذی حیات اشیاء کے اندر ایسی طاقتیں رکھی ہیں، بے شک عام انسان کے حواس بہت محدود ہیں مگر جانوروں کے حواس کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کتا اپنی متجسس ناک سے اس جانور کی بو سونگھ لیتا ہے، جو راستہ سے نکل گیا، چنانچہ کتّے کی اس

صلاحیت کو جرائم کی تفتیش میں استعمال کیا جاتا ہے، چور جس تالے کو توڑ کر کمرے میں گھسا ہے، اس تالے کو جاسوسی کتے (Scott Dog) کو سونگھایا جاتا ہے، اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ سیکڑوں انسانوں کے درمیان ٹھیک اس شخص کو تلاش کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، جس نے اپنے ہاتھ سے تالے کو چھوا تھا، کتنے جانور ہیں، جو ایسی آوازیں سنتے ہیں، جو ہماری قوت سماعت سے باہر ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جانوروں میں اشراق (Telepathy) کی صلاحیت پائی جاتی ہے، ایک مادہ پتنگے (Moth) کو کوٹھے میں کھلی کھڑکی کے پاس رکھ دیجئے، وہ کچھ مخصوص اشارے کرے گی، یہ اشارے اسی نوع کے نر پتنگے حیرت انگیز فاصلے سے سن لیں گے اور اس کا جواب دیں گے، جھینگر اپنے پاؤں یا پر ایک دوسرے پر رگڑتا ہے، رات کے سناٹے میں آدھے میل دور تک یہ آواز سنائی دیتی ہے، یہ چھ سوٹن ہوا کو ہلاتا ہے، اور اس طرح اپنے جوڑے کو بلاتا ہے، اس کی مادہ جو بظاہر بالکل خاموش ہوتی ہے، مگر پراسرار طریقہ پر کوئی ایسا بے آواز جواب دیتی ہے جو نر تک پہنچ جاتا ہے، نر اس پراسرار جواب کو جسے کوئی بھی نہیں سنتا، حیرت انگیز طور پر سن لیتا ہے، اور ٹھیک اسی سمت میں اس کے مقام پر جاکر اس سے مل جاتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک معمولی ٹڈے (Grasshopper) کی قوت سماعت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ہائیڈروجن کے ایٹم کے نصف قطر کے برابر کی حرکت تک کو وہ محسوس کر لیتا ہے۔

اس طرح کی کثیر مثالیں موجود ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ ایسے ذرائع مواصلات ممکن ہیں جو بظاہر نظر نہ آتے ہوں مگر اس کے باوجود وہ بطور واقعہ موجود ہوں اور مخصوص حواس رکھنے والے ذی حیات اس کا ادراک کر لیتے ہوں، ان حالات میں اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''مجھے خدا کی طرف سے ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں، جن کو عام لوگ نہیں سنتے'' تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، اگر اس دنیا میں ایسی آوازیں ممکن ہیں، جو آلات سنتے ہوں مگر

انسان نہ سنتے ہوں، اگر یہاں ایسی پیغام رسانی ہورہی ہے، جس کو ایک مخصوص جانور سن لیتا ہے، مگر دوسرا اسے نہیں سنتا، تو آخر اس واقعہ میں استبعاد کا کیا پہلو ہے کہ خدا اپنی مصالح کے تحت بعض مخفی ذرائع سے ایک انسان تک اپنا پیغام بھیجتا ہے، اور اس کے اندر ایسی صلاحتیں پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کو اخذ کر سکے اور اس کو پوری طرح سمجھ کر قبول کر لے، حقیقت یہ ہے کہ وحی والہام کے تصور اور ہمارے مشاہدات وتجربات میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ یہ اسی قسم کے مشاہدات کی ایک مخصوص صورت ہے، جس کا مختلف شکلوں میں ہم تجربہ کر چکے ہیں، یہ ایک امکان کو واقعہ کی صورت میں تسلیم کرنا ہے،

پھر اشراق اور غیب دانی کے تجربات بتاتے ہیں کہ یہ چیز صرف حیوانوں تک محدود نہیں بلکہ انسان کے اندر بھی بالقوہ اس قسم کی خصوصیات موجود ہیں، ڈاکٹر الکسس کیرل کے لفاظ میں ''فرد کی نفسیاتی سرحدیں مکاں اور زماں کے اندر محض فرضی (Suppositions) ہوتی ہیں (ص ۲۴۴) چنانچہ ایک عامل کسی آواز اور خارجی ذریعہ کے بغیر اپنے معمول پر توجہ ڈالتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اس پر مصنوعی نیند (Hypnotic Sleep) طاری کر سکتا ہے، اس کو ہنسا یا رلا سکتا ہے، اس کے ذہن میں مخصوص خیالات القاء کر سکتا ہے یہ ایک ایسا عمل ہے، جس میں نہ کوئی ظاہری آلہ استعمال ہوتا اور نہ عامل اور معمول کے سوا کوئی شخص اسے محسوس کرتا، پھر اسی نوعیت کا واقعہ بندے اور خدا کے درمیان کیوں ہمارے لئے نا قابل تصور ہو، خدا کو ماننے اور انسانی زندگی میں اشراقی قوت کا تجربہ کر لینے کے بعد ہمارے لئے وحی والہام سے انکار کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

دسمبر 1950ء کا واقعہ ہے، بویریا کے حکام نے ایک وی آئی عامل توجہ (Hypnotist) فرنٹر سٹروبلپر ریڈیو پروگرام میں ''خلل اندازی بذریعہ ٹیلی پیتھی'' کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا، ریجنا ہوٹل واقع میونخ میں اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے سٹروبل نے ایک تماشہ بیں کو تاش کا ایک پتہ اٹھا کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس کا نام حسب منشا ترتیب کے

ساتھ اپنے دل میں سوچ لے، ہپناٹسٹ نے دعویٰ کیا کہ وہ اس پتے کا نام مع ترتیب (جیسا کچھ پتہ اٹھانے والے نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا) خود جانے بغیر ریڈیو کے اناونسر کی جانب منتقل کردے گا، جو اس وقت ریڈیو پر خبریں سنا رہا تھا۔

چند ہی سکنڈ بعد حیرت زدہ سامعین نے میونخ ریڈیو کے اناؤنسر کی لڑکھڑاتی زبان میں سنا ''ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ'' پتے کا نام بھی درست تھا، اور ترتیب بھی پتہ اٹھانے والے کی سوچ کے عین مطابق تھی۔

اناونسر کی وحشت اس کی آواز سے واضح طور پر مترشح ہو رہی تھی، تاہم وہ خبریں سنائے چلا گیا ادھر سیکڑوں ریڈیو سننے والے اس عجیب واقعہ کا سبب معلوم کرنے کے لئے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کو ٹیلی فون کر رہے تھے، کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خبروں کے پروگرام کے درمیان ''ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ'' کے الفاظ کا کیا مطلب ہے، ڈاکٹر معائنہ کے لئے آیا تو اس نے پایا کہ اناونسر شدید اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے، اناونسر نے بتایا کہ خبریں پڑھتے پڑھتے اس کے سر میں اچانک ایک درد سا اٹھا، اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ (۱)

میں کہوں گا کہ اگر انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک انسان کے خیالات دوسرے انسان کو بعینہ منتقل کردے، جبکہ دونوں کے درمیان غیر معمولی فاصلہ ہو اور اس کے لئے کوئی ظاہری واسطہ استعمال نہ کیا گیا ہو تو القائے کلام کا یہی واقعہ خالقِ کائنات کی طرف سے کیوں

---

(۱) غیب دانی اور اشراق کے ان ثابت شدہ مظاہر کی توجیہہ کے لئے مختلف نظریے پیش کئے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ دماغ سے کسی قسم کی لہریں نکلتی ہیں، جو نہایت تیزی سے عالم میں پھیل جاتی ہیں، چنانچہ اسکو نظریہ امواج دماغی Brain-Wave Theory کہا جاتا ہے۔

Religion,Philosophy and Psychical Research
by C.D. broad,P.47.48

نیز ملاحظہ ہو الکسس کیرل کی کتاب صفحات ۴۹۔۲۴۴۔

وجود میں نہیں آسکتا، انسانی صلاحیت کا یہ اظہار، جس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، یہ ایک تجرباتی قرینہ ہے، جس سے ہم اس امکان کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کے بغیر کس طرح الفاظ اور معانی کا تعلق قائم ہوتا ہے، اور ایک کے خیالات دوسرے کو بعینہ منتقل ہوجاتے ہیں، اشراقی پیغام رسانی جو بندوں کے درمیان ایک معلوم اور ثابت شدہ واقعہ ہے، ایک ایسا قرینہ ہے، جس سے ہم اس اشراق کو سمجھ سکتے ہیں، جو بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے، اور جس کی کامل اور متعین صورت کو مذہب کی اصطلاح میں ''وحی'' کہا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وحی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسی قسم کا ایک مخصوص کائناتی اشراق ہے، جس کا تجربہ محدود پیمانے پر ہم انسانی زندگی میں بار بار کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

وحی والہام کو ممکن ماننے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں کہ خدا کسی انسان سے مخاطب ہو اور اس کے ذریعہ سے اپنا کلام بھیجے، اس کی ضرورت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول آدمی کو جس چیز سے باخبر کرتا ہے، وہ آدمی کی شدید ترین ضرورت ہے، مگر وہ خود اپنی کوشش سے اسے حاصل نہیں کرسکتا ہزاروں برس سے انسان حقیقت کی تلاش میں ہے، وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، انسان کا آغاز وانجام کیا ہے، خیر کیا ہے اور شر کیا ہے، انسان کو کیسے قابو میں لایا جائے، زندگی کو کیسے منظم کیا جائے کہ انسانیت کے سارے تقاضے اپنے صحیح مقام کو پاتے ہوئے متواتر ترقی کرسکیں، مگر ابھی تک اس تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی، تھوڑی مدت کی تلاش وجستجو کے بعد ہم نے لوہے، اور پٹرول کی سائنس بالکل ٹھیک جان لی اور اس طرح طبیعی دنیا کی سیکڑوں سائنسوں کے بارے میں صحیح ترین واقفیت حاصل کر لی، مگر انسان کی سائنس ابھی تک دریافت نہیں ہوئی، طویل ترین مدت کے درمیان بہترین دماغوں کی لاتعداد کوششوں کے باوجود یہ سائنس ابھی تک اپنے موضوع کی ابتدائیات کو بھی متعین نہ کرسکی، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ

اس معاملے میں ہمیں خدا کی مدد کی ضرورت ہے،اس کے بغیر ہم اپنا ’’دین‘‘ معلوم نہیں کر سکتے۔

یہ بات انسان جدید کو تسلیم ہے کہ زندگی کا راز ابھی تک اس کو معلوم نہ ہوسکا،مگر اسی کے ساتھ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اس راز کو معلوم کر لے گا،سائنس اور صنعت کے پیدا کئے ہوئے ماحول کا انسان کے لئے سازگار نہ ہونا اسی وجہ سے ہے کہ ’’اگر ایک طرف جامد مادے کے علوم کی وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی ہے تو دوسری طرف جاندار ہستیوں کے علوم بالکل ابتدائی حالت پر باقی ہیں‘‘ اس دوسرے شعبہ پر جن لوگوں نے کام کیا،وہ حقیقت کو نہ پاسکے،اور اپنے تخیلات کی دنیا میں بھٹک رہے ہیں،نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل Alexis carrel کے الفاظ میں

> ’’فرانسیسی انقلاب کے اصول اور مارکس اور لینن کے نظریے محض ذہنی اور قیاسی انسانوں پر منطبق ہوسکتے ہیں، اس بات کو صاف طور پر محسوس کرنا چاہئے کہ انسانی تعلقات کے قوانین (Law of Human Relations) اب تک معلوم نہیں ہوسکے ہیں،سماجیات اور اقتصادیات کے علوم محض قیاسی ہیں،اور نا قابل ثبوت ہیں۔‘‘
>
> Man the unknown, p.37

بلاشبہ موجودہ زمانے میں علوم نے بہت ترقی کی ہے،مگر ان ترقیات نے مسئلہ کو اور الجھا دیا ہے، اس نے کسی بھی درجہ میں اسکو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کی ہے، ڈبلیو،این سولیون (J.W.N.Sullivan) لکھتا ہے۔

> ’’سائنس نے موجودہ زمانے میں جس کائنات کو دریافت کیا ہے،وہ تمام فکری تاریخ کے مقابلے میں بہت زیادہ پراسرار ہے،اگرچہ فطرت کے بارے میں ہماری معلومات تمام پچھلے ادوار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں،مگر اس کے باوجود یہ کثیر معلومات ایک اعتبار سے بہت کم تشفی بخش ہیں۔کیونکہ ہر سمت میں ہم ابہام

(Ambiguities) اور تضاد (Contradictions) سے دو چار ہو رہے ہیں۔"

Limitation of Science,p.1

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرت ناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لئے ناقابل دریافت ہے، [۱] ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے، اس کے بغیر ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے، ہمارے بہترین جذبات اسے جاننا چاہتے ہیں، ہماری ہستی کا اعلیٰ ترین جزو جس کو ہم فکر یا ذہن کہتے ہیں، وہ اس کے بغیر مطمئن ہونے کے لئے کسی طرح راضی نہیں، ہماری زندگی کا سارا نظام اس کے بغیر ابتر ہے اور لاینحل معمہ بنا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے، مگر یہی سب سے بڑی ضرورت ہم خود سے پوری نہیں کر سکتے۔

کیا یہ صورت حال اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ انسان "وحی" کا محتاج ہے، زندگی کی حقیقت کا انتہائی ضروری ہونے کے باوجود انسان کے لئے ناقابل دریافت ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا انتظام اسی طرح خارج سے کیا جانا چاہئے، جیسے روشنی اور حرارت انسان کے لئے ناگزیر ہونے کے باوجود اس کے اپنے بس سے باہر ہے، مگر قدرت نے حیرت انگیز طور پر سورج کے ذریعہ اس کا انتظام کر دیا ہے۔۔۔۔(اس مسئلہ پر مزید مواد اگلے باب میں ملے گا۔)

وحی والہام کو ممکن اور ضروری تسلیم کر لینے کے بعد اب ہمیں یہ دکھنا ہے، کہ جو شخص اس کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ فی الواقع صاحب وحی ہے یا نہیں، ہمارے عقیدے اور ایمان کے مطابق اس قسم کے صاحبان وحی بہت کثیر تعداد میں اس زمین پر پیدا ہو چکے ہیں، مگر اس باب میں ہم خاص طور پر آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت پر گفتگو کریں گے، اس لئے کہ آپؐ کے دعوئے نبوت کا ثابت ہونا دراصل سارے انبیاء کے

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب صفحات 16۔19

دعوائے نبوت کا ثابت ہونا ہے، کیونکہ آپ دیگر انبیاء کے منکر نہیں ہیں، بلکہ ان کی تصدیق کرنے والے ہیں، اور اس لئے بھی کہ اب موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے آپ ہی خدا کے رسول ہیں، آپ کے بعد اب کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں ہے، اس لئے عملاً اب نسل انسانی کی نجات وخسران کا معاملہ آپ ہی کے دعوئے نبوت کو ماننے یا نہ ماننے سے متعلق ہے۔

سن عیسوی کے لحاظ سے 29/اگست 570ء کی صبح کو مکہ میں ایک بچہ پیدا ہوا، چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ خدا نے مجھ کو اپنا آخری رسول بنایا ہے، اور میرے پاس اپنا پیغام بھیج کر مجھے اس خدمت کے لئے مامور کیا ہے کہ میں اس کے پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچا دوں، جو میری اطاعت کرے گا وہ خدا کے یہاں سرفراز ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ ہلاک کر دیا جائے گا۔

یہ آواز آج بھی پوری شدت کے ساتھ ہمارے سروں پر گونج رہی ہے، یہ ایسی آواز نہیں ہے کہ کوئی شخص اس کو سنے اور نظر انداز کر دے، بلکہ یہ ایک زبردست مطالبہ ہے، اس آواز کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے اوپر غور کریں، اس کے بعد اگر اس کو غلط پائیں تو کھلے دل سے اسے رد کر دیں اور صحیح پائیں تو کھلے دل سے اس کو قبول کر لیں۔

کسی چیز کے علمی حقیقت بننے کے لئے اسے تین مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔

1۔ مفروضہ (Hypothesis)

2۔ مشاہدہ (Observation)

3۔ تصدیق (verification)

پہلے ایک مفروضہ یا تصور ذہن میں آتا ہے، پھر مشاہدہ کیا جاتا ہے، اس کے بعد اگر مشاہدہ سے اس کی تصدیق ہو جائے تو اس مفروضہ کو واقعہ تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس ترتیب میں کبھی فرق بھی ہو جاتا ہے، یعنی پہلے کچھ مشاہدات سامنے آتے ہیں، اور ان مشاہدات سے

ایک تصور یا مفروضہ ذہن میں قائم ہوتا ہے، پھر جب یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مشاہدات فی الواقع اس مفروضہ کی تصدیق کررہے ہیں تو وہ حقیقت قرار پاجاتا ہے۔

اس اصول کے مطابق نبی کا دعوائے نبوت گویا ایک ''مفروضہ'' کے طور پر ہمارے سامنے ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مشاہدات اس کی تصدیق کررہے ہیں یا نہیں، اگر مشاہدات اس کے حق میں گواہی دے دیں تو اس کی حیثیت ایک مصدقہ حقیقت (Verified Fact) کی ہوجائے گی، اور ہمارے لئے ضروری ہوجائے گا کہ ہم اس کو تسلیم کریں۔

اب دیکھئے کہ وہ کیا مشاہدات ہیں جو اس ''مفروضہ'' کی تصدیق کے لئے درکار ہیں جن کی بنیاد پر ہم نبی کے دعوے کو جانچیں اور اس کے مطابق دعوے کا صحیح یا غلط ہونا معلوم کریں، دوسرے لفظوں میں وہ کون سے خارجی مظاہر ہیں، جن کی روشنی میں یہ متعین ہوتا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے رسول تھے، ذات رسول میں جمع ہونے والی وہ کون سی خصوصیات ہیں، جن کی توجیہہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ہم ان کو خدا کا رسول مانیں، میرے نزدیک یہ حسب ذیل ہیں، جو شخص اپنے بارے میں رسول ہونے کا دعویٰ کرے، اس کے اندر دو خصوصیات لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔

1۔ایک یہ کہ وہ غیر معمولی طور پر ایک معیاری انسان ہو، کیونکہ وہ شخص جس کو ساری نسل انسانی میں اس لئے چنا جائے کہ وہ خدا سے ہم کلام ہو اور زندگی کی درستگی کا پروگرام اس کے ذریعہ سے منکشف کیا جائے، یقینی طور پر اس کو نسل انسانی کا بہترین فرد ہونا چاہئے اور اس کی زندگی میں اس کے آدرشوں (Adeals) کو بہ تمام وکمال ظہور کرنا چاہئے، اگر اس کی زندگی ان اوصاف سے مزین ہے تو یہ اس کے دعوے کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، کیونکہ اس کا دعویٰ اگر غیر حقیقی ہو تو وہ زندگی میں اتنی بڑی حقیقت بن کر نمایاں نہیں ہوسکتا کہ اس کو اخلاق وکردار میں ساری انسانیت سے بلند کردے۔

2۔دوسرے یہ کہ اس شخص کا کلام اور اس کا پیغام ایسے پہلوؤں سے بھرا ہوا ہونا چاہئے

جو عام انسان کے بس سے باہر ہو، جس کی امید کسی ایسے ہی انسان سے کی جاسکتی ہو، جس پر مالک کائنات کا سایہ پڑا ہو، عام انسان ایسا کلام پیش کرنے پر قادر نہ ہوسکیں۔

یہ دو معیار ہیں جن پر ہمیں رسول کے دعوئے نبوت کو جانچنا ہے۔

پہلی بات کے سلسلے میں تاریخ کی قطعی شہادت یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک غیر معمولی سیرت کے آدمی تھے، ہٹ دھرمی کے ذریعہ تو کسی بھی حقیقت کا انکار ممکن ہے، اور دھاندلی کی زبان میں ہر الٹی بات کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے، یہ منظر ہم نے خود اپنے ملک میں دیکھ چکے ہیں کہ کمیونسٹ چین نے صریح طور پر ہندستانی سرحد کی خلاف ورزی کی اور جب احتجاج کیا گیا تو الٹا اس نے ہندستان کے اوپر الزام لگانا شروع کر دیا کہ وہ اس کی سرحد کے اندر گھس آیا ہے، ہندستان کے نام حکومت چین کا خط جو جنوری 1960ء میں شائع کیا گیا اس میں ہندستانی سرحد کے اندر واقع دو لاکھ تیس ہزار مربع کیلومیٹر پر چین کا حق جتایا گیا ہے اور چینی وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ چینی فوجوں کی پیش قدمی چین کے علاقے سے ہندوسانی فوجوں کو پیچھے ڈھکیلنے کے لئے عمل میں آئی ہے، مگر جو شخص اس قسم کے تعصب کا مریض نہ ہو اور کھلے دل سے حقیقت کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ لازماً تسلیم کرے گا کہ آپ ؐ کی زندگی اخلاقی حیثیت سے نہایت اعلیٰ وارفع تھی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی، اس سے پہلے آپ ؐ کا پورا دور اخلاقی لحاظ سے اس قدر ممتاز تھا کہ آپ ؐ کو لوگ سچا اور دیانت دار کہہ کر پکارنے لگے تھے "اَلصّادِقُ الامینْ" آپ ؐ کا مشہور لقب بن گیا تھا، آپ کے متعلق یہ بات ساری آبادی میں متفق علیہ تھی کہ آپ ؐ ایک نہایت ایمان دار شخص ہیں، اور کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

دعوئے نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا، جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجر اسود کو نئی تعمیر میں کون شخص اس کی جگہ پر نصب کرے، چار پانچ دن تک یہ اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ کہ تلواریں

چل جائیں، بالآخر طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص کرے گا جو کل صبح کو سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہو، دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے ''ھٰذا الْاَمِینُ رَضِینَا'' (امین آ گیا، ہم سب سے کے فیصلہ پر متفق ہیں) (بخاری، باب ما ذکر فی الحجر الاسود)

ہمیں تاریخ میں کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس کی زندگی بحث ونزاع کا موضوع بننے سے پہلے چالیس سال جیسی لمبی مدت تک لوگوں کے سامنے رہی ہو اور اس کے جاننے والے اس کی سیرت و کردار کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں۔

پہلی بار آپ پر غار حرا میں وحی اتری تو یہ آپؐ کے لئے ایک ایسا غیر معمولی واقعہ تھا، جس کا آپؐ کو پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، آپ شدت احساس کے ساتھ گھر لوٹے اور اپنی اہلیہ سے، جو آپؐ سے عمر میں بڑی تھیں، اس واقعہ کا ذکر کیا، اہلیہ کا جواب تھا۔۔۔۔۔'' اے ابوالقاسم! خدا یقیناً آپؐ کی حفاظت کرے گا، کیونکہ آپؐ سچ بولتے ہیں، آپ دیانت دار ہیں، آپؐ برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں، اور لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔''

ابو طالب آپؐ کے چچا تھے، ان کے سامنے آپؐ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے ماننے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ نہیں سکتا، مگر اس کے بعد جب انھیں اپنے لڑکے علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے معلوم ہوا کہ وہ آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں تو ابو طالب نے کہا'' بیٹے! تم اس کے لئے آزاد ہو کیونکہ مجھے یقین ہے کہ محمد تم کو خیر کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں بلائیں گے۔'' (آئیڈیل پرافٹ صفحہ 68)

نبوت ملنے کے بعد جب آپ نے پہلی بار کوہ صفا کے دامن میں لوگوں کو جمع کر کے اپنی دعوت پیش کی اس وقت آپؐ نے اپنی دعوتی تقریر شروع کرنے سے پہلے حاضرین سے یہ سوال کیا'' تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے'' جواب میں بالاتفاق یہ آواز آئی۔

ماجرّبنا علیک الاّصدقا۔ تمھارے اندر ہم نے سچائی کے

سوا کوئی اور بات کبھی نہیں دیکھی ہے۔ (متفق علیہ)

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ابتدائی زندگی کے بارے میں یہ ایک ایسا ممتاز تاریخی ریکارڈ ہے جس کی مثال کسی بھی شاعر، فلسفی، مفکر یا مصنف کے یہاں نہیں مل سکتی۔

جب آپؐ نے پیغمبری کا اعلان کیا تو مکہ کے لوگ جو آپؐ کو اچھی طرح جانتے تھے، ان کے لئے یہ سوال خارج از بحث تھا کہ آپؐ کو نعوذ باللہ جھوٹا یا جعل ساز سمجھیں، کیونکہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اب تک کی پوری زندگی کے بالکل خلاف تھا، اس لئے انھوں نے کبھی آپؐ پر اس قسم کا الزام نہیں لگایا، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اس شخص کی عقل کھو گئی ہے، وہ شاعرانہ مبالغہ کر رہے ہیں، اور ان پر کسی کا جادو چل گیا ہے، ان پر جنات سوار ہے، مخالفین نے یہ سب کچھ کہا مگر کسی کی جرأت یہ نہ ہوئی کہ وہ آپؐ کی صداقت اور دیانت داری پر شبہ ظاہر کرے، یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ایک شخص جس کی قوم اس کی دشمن ہو چکی ہے، اور وطن میں اس کا رہنا بھی اسے گوارا نہیں ہے، اس شخص کے بارے میں اس کی دشمن قوم کا حال تاریخ یہ بیان کرتی ہے۔

ليس بمكة اَحدعنده شئ يخشى عليه الاوضعه عنده لمّايعلم من صدقه وامانته

مکہ میں جس کسی کے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کے بارے میں اسے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو اسے آپؐ کے پاس رکھ دیتا، کیونکہ ہر ایک کو آپؐ کی سچائی اور دیانتداری کا یقین تھا۔ (سیرت ابن ہشام جلد 2 صفحہ 298)

نبوت کے تیرہویں سال عین اس وقت جب کہ آپؐ کے مخالفین آپؐ کا مکان گھیرے ہوئے کھڑے تھے، اور اس بات کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ باہر نکلتے ہی آپ کو قتل کر دیں گے، آپؐ گھر کے اندر اپنے نوجوان عزیز علیؓ بن ابی طالب کو یہ وصیت کر رہے تھے کہ میرے پاس مکہ کے فلاں فلاں لوگوں کا مال امانت رکھا ہوا ہے، میرے جانے کے بعد تم ان

سب کا مال انھیں واپس کر دینا۔

نضر بن حارث جو آپؐ کا مخالف ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات میں قریش کے اندر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، اس نے ایک روز اپنی قوم سے کہا۔۔۔۔۔ ’’قریش کے لوگو! محمد کی دعوت نے تم کو ایسی مشکل میں ڈال دیا ہے، جس کا کوئی حل تمہارے پاس نہیں ہے، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے بچپن سے جوان ہوئے ہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمہارے درمیان سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ امانت دار اور سب سے زیادہ پسندیدہ شخص تھے، لیکن جب ان کے بال سفید ہونے کو آئے اور انھوں نے وہ کلام پیش کیا، جس کو تم سن رہے ہو تو اب تمہارا حال یہ ہے کہ تم کہتے ہو ’’یہ شخص جادوگر ہے، یہ شاعر ہے، یہ مجنون ہے‘‘ خدا کی قسم میں نے محمد کی باتیں سنی ہیں، محمد نہ جادوگر ہے، نہ وہ شاعر ہے، نہ وہ مجنون ہے، مجھے یقین ہے کہ کوئی اور مصیبت تمہارے اوپر آنے والی ہے۔‘‘ (سیرت النبی لابن ہشام جلد 1 صفحہ 319)

ابوجہل جو آپؐ کا سخت ترین دشمن تھا، وہ کہتا تھا۔۔۔۔۔۔ ’’محمد! میں یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹے ہو، مگر جس چیز کی تم تبلیغ کر رہے ہو اس کو میں صحیح نہیں سمجھتا۔‘‘ (ترمذی)

آپ کی نبوت چونکہ صرف عرب کے لئے نہیں تھی، بلکہ ساری دنیا کے لئے تھی، اس لئے اپنی زندگی ہی میں آپ نے ہمسایہ ممالک کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کئے، روم کے بادشاہ ہرقل کو آپؐ کا دعوت نامہ ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کے کچھ لوگ یہاں ہوں تو حاضر کئے جائیں، (۱) اسی زمانے میں قریش کے چند لوگ تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے_____ وہ دربار میں پہنچے تو ہرقل نے پوچھا تمہارے شہر میں جس شخص نے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، تم میں سے کوئی اس کا قریبی رشتہ دار بھی ہے_____ ابوسفیان نے

---

(۱) ہرقل (قیصر روم) ان دنوں ایرانیوں پر فتح یابی کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے بیت المقدس آیا ہوا تھا، وہیں اس کو خط ملا۔

جواب دیا وہ میرے خاندان کا ہے،اس کے بعد ہرقل اورابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی،اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

ہرقل: اس دعوے سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے ہوئے بھی سنا ہے۔

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ابوسفیان: ابھی تک اس نے کسی عہد کی خلاف ورزی نہیں کی۔

ہرقل نے یہ سن کر کہا۔۔۔۔''جب یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ آدمیوں کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بولا،تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کے معاملے میں اتنا بڑا جھوٹ گڑھ لیا ہو۔''

یہ اس وقت کی گفتگو ہے جب کہ ابوسفیان ابھی ایمان نہیں لائے تھے،اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمن تھے، بلکہ آپ کے خلاف جنگ کی قیادت کر رہے تھے،وہ خود کہتے ہیں کہ ''اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو دوسرے قریشی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ مجھے جھوٹا،مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا۔''(بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ)

ساری تاریخ میں کسی بھی ایسے شخص کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کے مخاطبین شدید مخالف ہونے کے باوجود اس کی زندگی اور سیرت کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں، اور یہ واقعہ بجائے خود آپ کے رسول اللہ ہونے کا کافی ثبوت ہے، یہاں میں ڈاکٹر لیٹنر کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

''میں بہت ادب کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر فی الواقع خدائے پاک کے یہاں سے، جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے،الہام ہوتا ہے تو محمد کا مذہب الہامی مذہب ہے، اوراگر ایثار نفس دیانتداری، راسخ الاعتقادی، نیکی اور بدی کی کامل جانچ

اور برائی دور کرنے کے عمدہ ذرائع ہی الہام کی ظاہری بیّن علامتیں ہیں تو محمد کا مشن الہامی تھا۔"

Life of Mohammad by M.abdul Fazal

جب آپؐ نے دعوت دینی شروع کی تو آپ کی قوم نے سخت ترین مصیبتیں ڈالیں، آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھنے میں آپ کے جسم پر نجاست لا کر انڈیل دیتے، ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ ابن ابی معیط نے آپؐ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچا کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، اس قسم کی حرکتوں سے جب آپؐ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو انھوں نے آپؐ کا اور آپؐ کے سارے خاندان کا بائیکاٹ کر دیا اور آپؐ کو مجبور کیا کہ بستی سے باہر ایک پہاڑی درہ میں جا کر بے یار و مددگار پڑے رہیں، اس دوران میں کوئی ضرورت کی چیز حتیٰ کہ کھانا پینا بھی نہ کوئی شخص آپؐ تک پہونچا سکتا تھا، اور نہ آپؐ کے ہاتھ فروخت کر سکتا تھا____ آپؐ اپنے خاندان کے ساتھ تین سال تک اس حصار میں اس طرح رہے کہ پہاڑی درخت (طلح) کے پتے کھاتے تھے، آپؐ کے ایک ساتھی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا میں نے پانی سے اسے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا تین سال کے بعد یہ حصار ختم ہوا۔

مکہ کے لوگوں کی یہ سنگ دلی دیکھ کر آپ طائف گئے جو مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر امراء و روساء کا شہر تھا، وہاں کے لوگوں نے آپ سے نہایت بُری طرح کلام کیا، ایک نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور پیغمبری کے لئے نہیں ملتا تھا" پھر ان لوگوں نے بدکلامی ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ طائف کے اوباشوں کو ابھار کر آپ کے پیچھے لگا دیا، یہ لوگ ہر طرف سے آپؐ کے اوپر ٹوٹ پڑے اور آپؐ پر پتھر پھینکنا شروع کیا، انھوں نے اس بری طرح آپ کو زخمی کیا کہ آپؐ کے جوتے خون سے بھر گئے، آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے جب چلنے لگتے تو پھر پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں

دیتے اور تالی بجاتے، اسی طرح شام ہونے تک آپ کے پیچھے لگے رہے، شام کو جب وہ زخم اور خون کی حالت میں آپؐ کو چھوڑ کر چلے گئے تو آپؐ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں کی آڑ میں پناہ لی، یہی وہ واقعہ ہے، جس کے متعلق آپؐ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ سے فرمایا: ''لقد لقیت من قومک ما لقیت و کان اشدّ ما لقیت منھم یوم العقبہ۔''

ان تمام ایذارسانیوں کے باوجود آپؐ اپنا کام کرتے رہے، بالآخر قریش نے طے کیا اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ آپؐ کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ ایک رات کو قریش کے تمام سرداروں نے ننگی تلواروں کے ساتھ آپؐ کا مکان گھیر لیا تا کہ صبح کو جب آپؐ باہر نکلیں تو آپؐ کو قتل کر دیا جائے، مگر اللہ کی مدد سے آپؐ بحفاظت گھر سے نکل گئے اور مدینہ جا کر قیام فرمایا۔

اس کے بعد قریش نے آپؐ کے ساتھ باضابطہ جنگ چھیڑ دی، اور دس سال تک مسلسل آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو جدال وقتال میں الجھائے رکھا، جس میں آپؐ کے دانت شہید ہوئے، بہترین ساتھی مارے گئے، وہ تمام مصائب جھیلنے پڑے جو جنگی حالت پیدا ہو جانے کے بعد جھیلنے ہوتے ہیں۔

اس طرح 23 سالہ تاریخ کے بعد آپؐ کی عمر کے آخری دنوں میں مکہ فتح ہوا، اس وقت آپؐ کے دشمن بے یارومددگار آپؐ کے سامنے کھڑے تھے، ایسے وقت میں فاتح جو کچھ کرتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے، مگر آپؐ نے ان سے کوئی انتقام نہیں لیا، آپؐ نے پوچھا: ''یامعشر قریش ماترون انی فاعل فیکم؟'' (قریش کے لوگو! بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا، انھوں نے کہا آپؐ شریف بھائی ہیں، اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، آپؐ نے فرمایا:

اذھبوا فانتم الطلقاء۔ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔
(سیرۃ النبی لابن ہشام مطبوعہ قاہرہ جلد 4 صفحہ 32)

اعلیٰ ترین سلوک کی یہ حیرت انگیز مثال تاریخ کا ایک ایسا معجزہ ہے کہ اگر وہ تاریخ سے قبل کا ہوتا اور تاریخی طور پر ثابت نہ ہوتا تو یقیناً کہنے والے کہتے کہ یہ واقعہ نہیں بلکہ افسانہ ہے، کیونکہ کوئی انسان اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا، پروفیسر باسورتھ اسمتھ Bosworth Smith کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں:۔

''جب میں آپؐ کے جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپؐ کیا تھے، اور کیا ہو گئے اور آپؐ کے تابع دار پیرووں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی، کیا کیا کارنامے دکھائے تو آپؐ مجھے سب سے بزرگ سب سے برتر اور اپنی نظیر آپؐ ہی دکھائی دیتے ہیں۔''

Mohammad and Mohammadenism, p 344

پھر آپؐ نے اپنی ساری زندگی میں جس بے غرضی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپؐ ہے، منصبِ رسالت سے پہلے آپؐ مکہ کے ایک کامیاب تاجر تھے، اور آپؐ کے نکاح میں حضرت خدیجہؓ جیسی عرب کی دولت مند خاتون تھیں لیکن رسالت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپؐ کی تجارت اور حضرت خدیجہؓ کی دولت دونوں ختم ہو گئیں، اور آپؐ کو اس سلسلے میں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ آپؐ خود فرماتے ہیں۔۔۔۔۔''مجھے خدا کی راہ میں اس قدر ڈرایا اور ستایا گیا کہ کسی کو اتنا ڈرایا اور ستایا نہیں گیا، مجھ پر تیس شب و روز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لئے کھانا، جسے کوئی جاندار کھا سکے، بس اتنی مقدار میں ہوتا تھا کہ بلال اسے بغل میں چھپا لیتے۔''

(مشکوٰۃ، کتاب الرقاق)

آپؐ نے صرف اپنے مشن کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھائیں، ورنہ آپؐ کے لئے دوسری زندگی بھی ممکن تھی، جب آپؐ مکہ میں تھے، قریش کی طرف سے عقبہ یہ پیش کش لے کر آپؐ کی خدمت میں آیا کہ ____ بھتیجے! اگر اس دعوت سے تم مال و دولت چاہتے ہو تو آؤ ہم اتنا مال

جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مال دار بن جاؤ، اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو بتاؤ ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ تمھیں اپنا سردار مان لیں، اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے، اگر یہ واقعہ نہیں ہے اور تم اپنے اندر جنون کی کیفیت پاتے ہو اور تمھیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنھیں تم دور نہیں کر سکتے تو ہم تمہارا علاج کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔''

عقبہ کی یہ تقریر آپؐ خاموشی سے سنتے رہے، اور اس کے بعد جواب دیا وہ یہ کہ قرآن کی کچھ آیتیں پڑھ کر اسے سنا دیں۔ (سیرت ابن ہشام جلد 1، صفحہ 314)

مدینہ میں آپؐ ایک ریاست کے مالک تھے، آپ کو ایسے جاں نثار خادم حاصل تھے کہ ان جیسے وفادار اور جاں نثار ساتھی، آج تک کسی کو نہیں ملے، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ آخر عمر تک آپؐ نے بالکل معمولی حالت میں گزار دی۔

حضرت عمرؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ''میں آپؐ کے حجرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپؐ بغیر قمیص کے کھجور کی معمولی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں، اور آپؐ کے جسم پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آ رہے ہیں، حجرہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو اس کا کل اثاثہ یہ تھا: ایک طرف تین چمڑے، ایک کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں تقریباً ایک صاع جو، یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا، آپؐ نے پوچھا روتے کیوں ہو، میں نے عرض کیا، قیصر و کسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے، اور آپؐ خدا کے رسول اس حال میں ہیں، یہ سن کر آپؐ بیٹھ گئے اور فرمایا: عمر! آخر تم کس خیال میں ہو، کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے۔''

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے گزر جاتے تھے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مکانات میں چولھا نہیں جلتا تھا، عروہؓ نے پوچھا تو آپ لوگ زندہ کیسے رہتی تھیں، انھوں نے جواب دیا کہ کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، ساتھ ہی بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے

تھے، ان ہی کی دوسری روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کے بعد ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن گیہوں کا استعمال کیا ہو، اور اسی حالت میں آپ دنیا سے چلے گئے۔

آپؐ نے قدرت رکھنے کے باوجود اس طرح زندگی گزاری اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی بیویوں اور اولاد کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار نہ درہم، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی، اس کے بجائے دنیا کی عظیم ترین حکومت کے بانی جس کو اپنی زندگی میں یہ معلوم تھا کہ اس کی حکومت ایشیا اور افریقہ سے گزرتی ہوئی یورپ کی سرحدوں تک پہنچ جائے گی، اس نے فرمایا۔

لانورث ماترکنا صدقة : ہم (پیغمبروں) کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔ (بخاری ومسلم)

آپؐ کے اخلاق وکردار اور آپؐ کے اخلاص وایثار کی ایک جھلک جو اوپر پیش کی گئی، یہ کچھ مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہی آپؐ کی پوری زندگی ہے، آپ کی ساری زندگی اسی قسم کے واقعات کا دوسرا نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کی انسانیت اتنی بلند تھی کہ اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس سطح کا انسان نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کبھی پیدا ہوسکتا۔

ایسے غیر معمولی انسان کے بارے میں یہ عجیب نہیں ہوگا کہ ہم اس کو خدا کا رسول مان لیں، بلکہ یہ عجیب ہوگا کہ ہم اس کے رسول ہونے کا انکار کردیں، کیونکہ آپؐ کو رسول مان کر ہم صرف آپؐ کی معجزاتی شخصیت کی توجیہہ کرتے ہیں، اگر ہم آپؐ کو رسول نہ مانیں تو ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں رہتا کہ ان حیرت انگیز اوصاف کا سرچشمہ کیا تھا، جبکہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک بھی انسان پیدا نہیں ہوا، پروفیسر باسورتھ اسمتھ کے یہ الفاظ ایک لحاظ سے حقیقت واقعہ کا اعتراف ہیں، اور دوسرے لحاظ سے وہ سارے انسانوں کو آپؐ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں:۔

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخر میں بھی اپنے لئے اسی منصب کا دعویٰ کیا، جس سے انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا، اور میں یہ یقین کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اعلیٰ ترین فلسفہ اور سچی مسیحیت ایک روز یہ تسلیم کرنے پر متفق ہوں گے کہ آپؐ ایک پیغمبر تھے، خدا کے سچے پیغمبر۔''

Mohammad and Mohammadenism, p 344

دوسرے پہلو سے رسول کی رسالت کا سب سے بڑا ثبوت وہ کتاب ہے، جس کو اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ اس کے اوپر خدا کی طرف سے اتری ہے، یہ کتاب بے شمار ایسی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے، جو اس کے بارے میں اس امر کا قطعی قرینہ پیدا کرتی ہیں کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

یہ بحث چونکہ مستقل اہمیت کی حامل ہے، اس لئے اس کو میں الگ باب میں بیان کروں گا۔

قرآن۔۔ خدا کی آواز

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

''پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزات دیئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے اور مجھ کو جو معجزہ عطا ہوا ہے، وہ قرآن ہے۔'' (بخاری، باب الاعتصام)

یہ ارشاد ہماری تلاش کے صحیح رخ کو متعین کرتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ رسول کی رسالت کو پہچاننے کے لئے آج ہمارے پاس جو سب سے بڑا ذریعہ ہے وہ، وہ کتاب ہے جس کو رسول نے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ وہ اس کے پاس خدا کی طرف سے اتری ہے، قرآن، رسول کا نمایندہ بھی ہے، اور رسول کے رسول برحق ہونے کی دلیل بھی۔

قرآن کی وہ کیا خصوصیات ہیں، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اترا ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، یہاں میں چند پہلوؤں کا مختصراً ذکر کروں گا۔

1۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جو قرآن کے طالب علم کو متاثر کرتی ہے، وہ قرآن کا چیلنج ہے، جو چودہ سو برس سے دنیا کے سامنے ہے، مگر آج تک اس کا جواب نہ دیا جا سکا، قرآن میں بار بار یہ اعلان کیا گیا ہے، کہ جو لوگ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کے بارے میں مشتبہ ہیں، اور اس کو محض اپنے جیسے ایک انسان کی تصنیف سمجھتے ہیں، وہ ایسی ایک کتاب بنا کر پیش کریں، بلکہ اس کے جیسی ایک سورہ ہی بنا کر دکھا دیں۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾ (البقرۃ)

ترجمہ: اپنے بندے پر اپنا جو کلام ہم نے اتارا ہے، اگر اس کے (کلام الٰہی ہونے کے) بارے میں تمھیں شبہ ہے تو اس کے جیسی ایک سورہ لکھ کر لے آؤ اور خدا کے سوا اپنے تمام شہداء کو بھی بلالو، اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو۔ (بقرہ۔23)

یہ ایک حیرت انگیز دعویٰ ہے، جو ساری انسانی تاریخ میں کسی بھی مصنف نہیں کیا اور نہ بقید ہوش وحواس کوئی مصنف ایسا دعویٰ کرنے کی جرأت کرسکتا، کیونکہ کسی بھی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھ دے جس کے ہم پایہ کتاب دوسرے انسان نہ لکھ سکتے ہوں، ہر انسانی تصنیف کے جواب میں اسی درجہ کی دوسری انسانی تصنیف تیار کی جاسکتی ہے، قرآن کا یہ کہنا کہ وہ ایک ایسا کلام ہے، جیسا کلام انسانی ذہن تخلیق نہیں کرسکتا، اور ڈیرھ ہزار برس تک کسی انسان کا اس پر قادر نہ ہونا قطعی طور پر ثابت کردیتا ہے کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدائی منبع (Divine Origin) سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، اور جو چیز خدائی منبع سے نکلی ہو اس کا جواب کون دے سکتا ہے۔

تاریخ میں چند مثالیں ملتی ہیں جبکہ اس چیلنج کو قبول کیا گیا، سب سے پہلا واقعہ لبید بن ربیعہ کا ہے جو عربوں میں اپنے قوت کلام اور تیزیٔ طبع کے لئے مشہور تھا، اس نے جواب میں ایک نظم لکھی جو کعبہ کے پھاٹک پر آویزاں کی گئی، اور یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو صرف کسی اعلیٰ ترین شخص ہی کو ملتا تھا، اس واقعہ کے جلد ہی بعد کسی مسلمان نے قرآن کی ایک سورہ لکھ کر اس کے قریب آویزاں کردی، لبید (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) جب اگلے روز کعبہ کے دروازہ پر آئے اور سورہ پڑھا تو ابتدائی فقروں کے بعد ہی وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور اعلان کیا بلاشبہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، اور میں اس پر ایمان لاتا ہوں [1]۔۔۔۔ حتیٰ کہ عرب کا یہ مشہور شاعر قرآن کے ادب سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی شاعری چھوٹ گئی، بعد کو ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ان سے اشعار کی فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا:

---

(۱) Mohammad the Holy Prophet by H.G.Sarwar, p.448

''جب خدا نے مجھے بقرہ اور آل عمران جیسا کلام دیا ہے تو اب شعر کہنا میرے لئے زیبا نہیں۔'' (استیعاب ابن عبدالبر، ترجمہ لبید)

دوسرا اس سے زیادہ عجیب واقعہ ابن المقفع کا ہے جس کو نقل کرتے ہوئے ایک مستشرق Wollaston لکھتا ہے۔

"That Muhammad`s boast as to the literary excellence of the Quran was not unfounded, is further evidenced by a circumstance,which occourred about a century ofter the establishment of Islam."

Mohammad, his life and Doctrines, p.143

یعنی یہ بات کہ قرآن کے اعجاز کلام کے بارے میں محمد کی شیخی غلط نہیں تھی، یہ اس واقعہ سے ثابت ہوجاتا ہے، جو اسلام کے قیام کے سو سال بعد پیش آیا۔

واقعہ یہ ہے کہ منکرین مذہب کی ایک جماعت نے یہ دیکھ کر کہ قرآن لوگوں کو بڑی شدت سے متاثر کررہا ہے، یہ طے کیا کہ اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کی جائے، انھوں نے اس مقصد کے لئے ابن المقفع (م727ء) سے رجوع کیا جو اس زمانے کا ایک زبردست عالم، بے مثال ادیب اور غیر معمولی ذہین وطباع آدمی تھا، ابن المقفع کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ راضی ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میں ایک سال میں یہ کام کروں گا البتہ اس نے یہ شرط لگائی کہ اس پوری مدّت میں اس کی تمام ضروریات کا مکمل انتظام ہونا چاہئے تا کہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے ذہن کو اپنے کام میں مرکوز رکھے۔

نصف مدت گزر گئی تو اس کے ساتھیوں نے یہ جاننا چاہا کہ اب تک کیا کام ہوا ہے۔ وہ جب اس کے پاس گئے تو انھوں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ بیٹھا ہوا ہے۔ قلم اس کے ہاتھ میں ہے، گہرے مطالعہ میں مستغرق ہے، اس مشہور ایرانی ادیب کے سامنے ایک سادہ کاغذ پڑا ہوا ہے، اس کی نشست کے پاس لکھ لکھ کر پھاڑے ہوئے کاغذات کا ایک انبار ہے

اوراسی طرح سارے کمرہ میں کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا ہے، اس انتہائی قابل اور فصیح اللسان شخص نے اپنی بہترین قوت صرف کر کے قرآن کا جواب لکھنے کی کوشش کی۔مگر وہ بری طرح ناکام رہا،اس نے پریشانی کے عالم میں اعتراف کیا کہ صرف ایک فقرہ لکھنے کی جدو جہد میں اس کے چھ مہینے گزر گئے مگر وہ لکھ نہ سکا، چنانچہ ناامید اور شرمندہ ہوکر وہ اس خدمت سے دست بردار ہو گیا۔

اس طرح قرآن کا چیلنج بدستور آج تک قائم ہے اور صدیوں پر صدیاں گزر گئیں مگر کوئی اس کا جواب نہ دے سکا،قرآن یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے جو بلا اشتباہ یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مافوق ہستی کا کلام ہے ،اگر آدمی کے اندر فی الواقع سوچنے کی صلاحیت ہوتو یہی واقعہ ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

قرآن کے اس معجزانہ کلام کا نتیجہ تھا کہ عرب کے لوگ، جو فصاحت و بلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے،اور جن کو اپنے کلام کی برتری کا اتنا احساس تھا کہ عرب کے سوا بقیہ دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے، وہ قرآن کے کلام کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئے ،تمام لوگوں کو اس کے برتر ادب کا اعتراف کرنا پڑا،ضماد ازدی نام کے ایک عرب آپ کے پاس آئے ،وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے،آپ نے انھیں قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا،وہ سن کر حیران رہ گئے،ان کی زبان سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا۔

> ’’خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی،جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں،مگر تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے، یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا۔‘‘
>
> (مسلم باب تخفیف الصلوۃ)

اس طرح کے بے شمار اعترافات ہیں، جو قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں،اور حال کے واقعات میں بھی۔

2۔دوسری چیز جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں،وہ قرآن کی پیشین گوئیاں ہیں، یہ پیشین

گوئیاں حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔

تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے ذہین اور حوصلہ مند لوگ ملتے ہیں جنھوں نے اپنے یا دوسرے کے بارے میں پیشین گوئی کی جرأت کی ہے، مگر ہمیں معلوم ہے کہ زمانے نے کبھی ایسے لوگوں کی تصدیق نہیں کی، موافق حالات غیر معمولی صلاحیت، اعوان وانصار کی کثرت اور ابتدائی کامیابیوں نے اکثر لوگوں کو اس دھوکے میں ڈال دیا ہے کہ وہ ایک ایسے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو عین اس کی مرضی کے مطابق ہے، انھوں نے فوراً ایک یقینی انجام کا دعویٰ کر دیا، مگر تاریخ نے ہمیشہ اس قسم کے دعوؤں کی تردید کی ہے، اس کے برعکس بالکل مخالف اور ناقابل قیاس حالات میں بھی قرآن کے الفاظ اس طرح صحیح ثابت ہوئے کہ ان کی توجیہہ کے لئے تمام انسانی علوم بالکل ناکافی ہیں، ہم انسانی تجربات کی روشنی میں کسی طرح ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی توجیہہ کی واحد صورت صرف یہ ہے کہ ان کو غیر انسانی ہستی کی طرف منسوب کیا جائے۔

نپولین بونا پارٹ اپنے وقت کا عظیم جنرل تھا، اس کی ابتدائی کامیابیاں بتاتی تھیں کہ وہ سیزر اور اسکندر کے لئے بھی ایک قابل رشک فاتح ثابت ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین کے ذہن میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ وہ تقدیر کا مالک ہے، اس کو اپنے اوپر اتنا اعتماد ہو گیا کہ اپنے قریبی مشیروں تک کے مشورے کو قبول کرنا اس نے چھوڑ دیا، اس کا کہنا تھا کہ کامل غلبہ کے سوا میرا کوئی دوسرا انجام نہیں ہوسکتا، مگر اس کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے، ۱۲ر جون 1815ء کو نپولین اپنی سب سے بڑی فوج لے کر پیرس سے روانہ ہوا کہ دشمن کو اس کے راستے ہی میں ختم کردے، اس کے چھ دن بعد واٹرلو (بلجیم) میں ڈیوک آف ولنگٹن (Duke of Wellengton) نے خود اس کو فیصلہ کن شکست دینے میں کامیابی حاصل کی، جو اس وقت برطانیہ، ہالینڈ اور جرمنی کی فوجوں کی قیادت کر رہا تھا، اب نپولین کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں، وہ اپنا تخت چھوڑ کر امریکہ کے ارادے سے بھاگ کھڑا ہوا، مگر ابھی

ساحل پر پہنچا تھا، کہ دشمن کے نگراں دستوں نے اسے پکڑلیا، اوراس کومجبورکیا کہ وہ ایک برطانوی جہاز پرسوار ہو، اس کے بعداس کوجلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لئے جنوبی اٹلانٹک کے جزیرہ سینٹ ہیلینا پہنچادیا گیا، جہاں وہ تنہائی اور تلخ حالات میں پڑا پڑا 5/ مئی 1821ء کومر گیا۔

مشہور کمیونسٹ مینی فسٹو جو 1848 میں شائع ہوا، اس میں سب سے پہلے جس ملک میں اشترا کی انقلاب کی امید ظاہر کی گئی تھی، وہ جرمنی ہے، مگرایک سوبیس سال گزرنے کے بعد بھی جرمنی اب تک اس ''انقلاب'' سے نا آشنا ہے، مئی 1859ء میں کارل مارکس نے لکھا تھا ''سرخ جمہوریت پیرس کے اوپر سے جھانک رہی ہے'' اس پیشین گوئی کوایک صدی سے زیادہ مدّت گزرگئی، مگرابھی تک پیرس کے اوپرسرخ جمہوریت کا آفتاب نہیں نکلا، اڈولف ہٹلر نے 14/ اپریل 1936ء کومیونخ کی مشہور تقریر میں کہا تھا۔

> ''میں اپنے راستہ پراعتماد کے ساتھ چل رہاہوں کہ غلبہ میرے حق میں مقدر ہوچکا ہے۔'' (۱)

مگرساری دنیاجانتی ہے کہ جرمنی کے اس عظیم ڈکٹیٹر کے حق میں جو چیز مقدر تھی وہ یہ کہ وہ شکست کھائے اورخودکشی کر کے اپنی جان دے، خوداپنے ملک میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جنوری 1954ء میں مدورامیں کمیونسٹ پارٹی کی تیسری کانگریس کے موقع پر کمیونسٹ لیڈر مسٹرسی، جوشی نے اعلان کیا تھا کہ ''ہندستان کے آیندہ عام الیکشن میں کمیونسٹ پارٹی ٹراونکور، کوچن (کیرالا) مدراس، آندھرا مغربی بنگال اورآسام میں اپنی وزارت بنالے گی۔'' اس کے بعدکئی الیکشن آئے اور چلے گئے، مگرحالات نے ان الفاظ کی تصدیق نہیں کی، اس طرح کی بےشمارمثالوں کے ہجوم میں صرف کتاب الٰہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے جس جس چیز کی پیشین گوئی کی وہ حرف بحرف پوری ہوئی ـــــــ یہ واقعہ اس بات کے ثبوت

---

(۱) A Study of History (Abridgment) p.447

کے لئے کافی ہے کہ یہ کلام ایسے مافوق ذہن سے نکلا ہے، جس کے قبضہ میں حالات کی باگ ڈور ہے اور جو ازل سے ابد تک کی خبر رکھتا ہے۔

یہاں میں صرف دو پیشین گوئیوں کا ذکر کروں گا، ایک خود پیغمبر اسلام کا غلبہ، دوسرے رومیوں کی دوبارہ فتح کی پیشین گوئی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت شروع کی تو تقریباً تمام عرب آپؐ کا مخالف ہو گیا ایک طرف مشرک قبائل تھے، جو آپؐ کے جانی دشمن ہو گئے، دوسری طرف یہودی سرمایہ دار تھے، جو ہر قیمت پر آپؐ کو ناکام بنا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، تیسری طرف منافقین تھے، جو بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے، مگر ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی جماعت میں گھس کر آپؐ کی تحریک کو اندر سے ڈائنامیٹ کریں، اس طرح طاقت، سرمایہ اور اندرونی سازش ــــــ سہ طرفہ مخالفتوں کے طوفان میں آپؐ اس طرح اپنی تحریک چلا رہے تھے کہ تھوڑے سے غلاموں اور کمزور لوگوں کے سوا کوئی آپ کا ساتھی نہ تھا، مکہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے گنتی کے چند آدمی جو آپؐ کا ساتھ دینے کے لئے نکلے ان کا بھی حال یہ ہوا کہ آپؐ کی طرف آتے ہی وہ اپنی برادری سے کٹ گئے اور ان کی قوم ان کی بھی اسی طرح دشمن ہو گئی جس طرح وہ خدا کے رسول کی دشمن تھی۔

یہ تحریک یوں ہی چلتی رہی، یہاں تک کہ حالات اس قدر شدید ہو گئے کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر جانا پڑا، اس طرح آپؐ اور آپؐ کے ساتھی جو پہلے ہی نہتے اور کمزور تھے، مدینے میں اس حالت میں جمع ہوئے کہ اپنے وطن میں جو کچھ ان کے پاس تھا وہ بھی چھن چکا تھا۔ مدینے میں ان لوگوں کی بے کسی کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینے میں آپ کے جو ساتھی جمع ہوئے تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جن کے رہنے کے لئے کوئی باقاعدہ مکان نہیں تھا، وہ چھپّر پڑے ہوئے ایک چبوترے پر زندگی گزارتے تھے، اسی مناسبت سے ان کا نام ''اصحاب صفہ'' پڑ گیا تھا، اس چبوترے پر مختلف اوقات میں جو لوگ رہے، ان کی تعداد تقریباً

چارسو بتائی جاتی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا ہے جن میں سے ہر شخص کا حال یہ تھا کہ اس کے پاس یا تو صرف ایک تہبند تھی، یا صرف ایک چادر، وہ اس کو اپنی گردن میں باندھ لیتا تھا، اور وہ اس کی پنڈلی تک لٹکتا رہتا تھا، حضرت ابو ہریرہ اس زمانے کا خود اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ مسجد نبوی میں خاموش لیٹا رہتا تھا، اور لوگ سمجھتے تھے کہ میں بیہوش ہوں، حالانکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ مسلسل فاقے کی وجہ سے میں نڈھال ہو جاتا تھا، اور مسجد میں جا کر لیٹ رہتا تھا۔ (ترمذی)

چند انسانوں کا یہ بے سروسامان قافلہ مدینے کی زمین پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ ہر آن یہ خطرہ تھا کہ چاروں طرف اس کے پھیلے ہوئے دشمن اس کو اچک لے جائیں گے، مگر خدا کی طرف سے بار بار آپ کو یہ بشارت آتی تھی کہ تم ہمارے نمائندے ہو اور تمھیں کوئی زیر نہیں کر سکتا (کتب اللہ لأغلبنّ انا ورسلی) ساری مخالفتوں کے علی الرغم اللہ تم کو غالب کر کے رہے گا۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۸ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝۹ (الصف)

ترجمہ: یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو مکمل کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو، وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے، خواہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ (صف 8،9)

اس دعوے کو تھوڑے ہی دن گزر رہے تھے کہ سارا عرب آپؐ کے قدموں کے نیچے آ گیا، تھوڑے سے نہتے اور بے سروسامان لوگ ان پر غالب آ گئے جو تعداد میں بہت زیادہ تھے، وقت جن کا ساتھ دے رہا تھا اور جن کے پاس ہتھیار اور ساز و سامان کا زبردست ذخیرہ موجود تھا۔

مادی اصطلاحات میں اس بات کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی کہ آپؐ کو عین اپنی پیشین

گوئی کے مطابق عرب کے لوگوں اور ہمسایہ ملکوں پر کیسے اتنا زبردست غلبہ حاصل ہوگیا، اس کی صرف ایک ہی توجیہہ ممکن ہے، وہ یہ کہ آپ خدا کے نمائندے تھے، خدا نے اپنی مدد سے آپ کو آپ کے دشمنوں کے مقابلے میں غالب کیا اور آپ کے مشن کو اس حد تک کامیاب کیا کہ آپ کے دشمن آپؐ کے ساتھی بن گئے، غیر معمولی مخالفت اور زبردست دشمنوں کے مقابلے میں نبی امی کا عین اپنے دعوے کے مطابق کامیاب ہونا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپؐ کائناتی طاقت کے نمائندے تھے، اگر آپ محض ایک انسان ہوتے تو کبھی یہ ممکن نہیں تھا کہ آپؐ کے الفاظ تاریخ بن جائیں، ایسی تاریخ جس کی مثال سارے انسانی واقعات میں کوئی ایک بھی نہیں، جے، ڈبلیو، ایچ اسٹوبرٹ (J.W.H.Stobart) کے الفاظ میں ''آپؐ کے پاس جتنے کم ذرائع تھے، اور جو وسیع اور مستقل کارنامہ آپ نے انجام دیا، اس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری انسانی تاریخ میں اتنا نمایاں طور پر درخشاں نام اور کوئی نظر نہیں آتا جتنا نبی عربی کا ہے۔''(۱)

یہ آپؐ کے نمائندۂ الٰہی ہونے کی ایسی حیرت انگیز دلیل ہے کہ سر ولیم میور (William Muir) جیسے شخص کو بھی بالواسطہ طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑا:۔

> ''محمدؐ نے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، انھیں مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ دن رات اپنی کامیابی کا انتظار رہتا تھا، بظاہر بالکل غیر محفوظ، بلکہ یوں کہئے کہ شیر کے منھ میں رہ کر وہ ہمت دکھائی کہ اس کی نظیر اگر کہیں مل سکتی ہے تو صرف بائبل میں جہاں ایک نبی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر خدا سے کہا تھا کہ۔۔صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔''

Life of Mohammed, p.221

2۔ قرآن کی دوسری پیشین گوئی جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ رومیوں کا ایرانیوں پر غلبہ ہے جو قرآن کی تیسویں سورہ (روم) میں وارد ہوئی ہے:۔

---

(۱) Islam anits Founder, p. 228

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ (الروم)

جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں خلیج فارس کے دوسرے ساحل پر ایرانی حکومت قائم تھی، اور مغرب میں بحر احمر کے کناروں سے لے کر اوپر بحر اسود تک وہ سلطنت تھی، جو تاریخ میں سلطنت روم کے نام سے مشہور ہے، اول الذکر کا دوسرا نام ساسانی سلطنت اور موخر الذکر کا بازنطینی سلطنت ہے، ان دونوں حکومتوں کی سرحدیں عرب کے شمال میں عراق کے مشہور دریاؤں دجلہ وفرات پر آکر ملتی تھیں، یہ دونوں اپنے زمانے کی طاقت ور ترین سلطنتیں تھیں، رومی سلطنت کی تاریخ مورخ گبن کے بیان کے مطابق دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اور اس کو اپنے وقت کی مہذب ترین سلطنت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

روم کے زوال پر جتنا لکھا گیا ہے، اتنا کسی تہذیب کے خاتمے پر نہیں لکھا گیا (۱) اور اگر چہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہوسکتی جو دوسری تمام کتابوں سے آدمی کو مستغنی کر دے، تاہم مجموعی اعتبار سے اس عنوان پر سب سے زیادہ مفصل اور معتمد مواد اڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے:۔

The History of the Decline and fall of the roman Empire

اس کتاب کی پانچویں جلد کے دوسرے باب میں قابل مصنف نے اس دور کے واقعات قلم بند کئے ہیں، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، روم کے ایک سابق بادشاہ قسطنطین نے 325ء میں مسیحیت قبول کر کے اس کو سرکاری مذہب کے حیثیت دیدی تھی، چنانچہ روم کی بیشتر آبادی اب حضرت عیسیٰ کی پیرو تھی، اس کے مقابلے میں ایرانی سورج دیوتا کے پرستار تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے روم پر جس بادشاہ کی حکومت تھی، اس کا نام ماریس (Maurice) تھا، ماریس کی نااہلی اور بدانتظامی کی وجہ سے آپ کو نبوت ملنے سے آٹھ سال قبل 602ء میں اس کی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کردی، اس بغاوت

---

(۱) Western Civilisation.p 210

کی قیادت ایک فوجی کپتان فوکاس (Phocas) نے کی تھی، بغاوت کامیاب ہوگئی، اور فوکاس روم کے شہنشاہ کی جگہ تخت پر قابض ہوگیا۔۔۔۔۔۔اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد شہنشاہ روم ماریس اور اس کے خاندان کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کردیا۔

فوکاس نے اپنی ہمسایہ سلطنت ایران کو ایک سفیر بھیج کر نئی تخت نشینی کی اطلاع دی، اس وقت ایران کے تخت پر نوشیرواں عادل کا لڑکا خسرو پرویز (Chosroes2) تھا، خسرو پرویز کو 91-590ء میں اندرونی سازش اور بغاوت کی وجہ سے اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا تھا، اس زمانے میں مقتول رومی شہنشاہ ماریس نے اس کو اپنے علاقہ میں پناہ دی تھی، اور دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی مدد کی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں دنوں قسطنطنیہ کے زمانۂ قیام میں خسرو نے ماریس کی لڑکی سے شادی کرلی تھی اور اس رشتہ کی بنا پر ماریس کو وہ اپنا باپ کہتا تھا، چنانچہ جب خسرو کو رومی انقلاب کی خبر ملی تو وہ سخت برہم ہوا، اس نے رومی سفیر کو قید کرادیا، اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

اس کے بعد فوراً اس نے اپنی فوجوں کے ذریعہ روم پر چڑھائی کردی، 603ء میں اس کی فوجیں دریائے فرات کو پار کرکے شام کے شہروں میں داخل ہوگئیں۔۔۔۔۔۔فوکاس اپنی نااہلی کی وجہ سے اس غیر متوقع حملہ کو روکنے میں کامیاب نہ ہوا، ایرانی فوجیں بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ انطاکیہ کو فتح کرتے ہوئے یروشلم پر قابض ہوگئیں، ایرانی سلطنت کے حدود فرات سے پار کرکے یکایک وادیٔ نیل تک وسیع ہوگئے، سابقہ رومی سلطنت کے مذہبی داروگیری کی وجہ سے چرچ کے مخالف فرقے نسطوری اور یعقوبی نیز یہودی پہلے سے رومی حکومت سے ناراض تھے، اب انھوں نے روم دشمنی میں نئے فاتحین کا ساتھ دیا، اس چیز نے خسرو کی کامیابی کو بہت آسان بنادیا۔

فوکاس کی ناکامی دیکھ کر بعض اعیان سلطنت نے افریقی مقبوضہ کے رومی گورنر کے یہاں خاموش پیغام بھیجا کہ وہ ملک کو بچانے کی کوشش کرے، اس نے اپنے لڑکے ہرقل

(Heraclius) کواس مہم پر روانہ کیا، ہرقل سمندر کے راستہ سے فوج لے کر افریقہ سے روانہ ہوا، اور یہ ساری کارروائی اس قدر رازداری کے ساتھ انجام پائی کہ فوکاس کو اس وقت تک اس کی خبر نہیں ہوئی جب تک اس نے اپنے محل سے سمندر میں آتے ہوئے جہازوں کے نشانات نہیں دیکھ لئے، ہرقل معمولی لڑائی کے بعد دارالسلطنت پر قابض ہو گیا، اور فوکاس قتل کر دیا گیا۔

ہرقل نے فوکاس کو تو ختم کر دیا، مگر وہ ایرانی سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا، 616ء تک رومی دارالسلطنت سے باہر اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی اور جنوبی حصّہ کھو چکے تھے، عراق، شام فلسطین، مصر، ایشیائے کوچک، ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا، رومی سلطنت قسطنطنیہ کی چہار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، محاصرہ کی وجہ سے تمام راستے بند تھے، چنانچہ شہر میں قحط اور وبائی امراض نے پھیل کر مزید مصیبت پیدا کر دی، رومی سلطنت کے عظیم الشان درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا، اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا، خود قسطنطنیہ کے اندر دشمن کے گھس آنے کا خوف تمام آبادی پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ تمام کاروبار بند تھے، وہ پبلک مقامات جہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی، اب سنسان پڑے ہوئے تھے۔

آتش پرست حکومت نے رومی علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسیحیت کو مٹانے کے لئے شدید ترین مظالم شروع کئے، مذہبی شعائر کی توہین شروع کی گئی، گرجا گھر مسمار کر دئے گئے، تقریباً ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کر دیا گیا ہر جگہ آتش کدے تعمیر کئے گئے اور مسیح کے بجائے آگ وسورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا مقدس صلیب کی اصل لکڑی جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اس پر مسیح نے جان دی تھی وہ چھین کر مدائن پہنچا دی گئی۔

مورخ گبن کے الفاظ میں:۔

> ''اگر خسرو کے مقاصد واقعی نیک اور درست ہوتے تو وہ باغی فوکاس کے خاتمہ کے بعد رومیوں سے اپنے جھگڑے کو ختم کر دیتا اور افریقی فاتح کا اپنے بہترین ساتھی کی حیثیت سے استقبال کرتا جس نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کے محسن ماریس کا انتقام لے لیا تھا، مگر جنگ کو جاری رکھ کر اس نے اپنے اصل کردار کو نمایاں کر دیا۔'' (ص74)

جزیرۃ العرب اور اس کے پڑوسی ممالک

اس وقت ایرانی شہنشاہیت اور رومی سلطنت میں کیا فرق پیدا ہو چکا تھا اور ایرانی فاتح اپنے کو کتنا بڑا سمجھنے لگا تھا، اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے، جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا:

''سب خداؤں سے بڑا خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام، تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے، کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا۔''

ان حالات نے قیصر روم کو بالکل مایوس کر دیا، اور اس نے طے کر لیا کہ اب وہ قسطنطنیہ چھوڑ کر بحری راستہ سے اپنی جنوبی افریقہ کی ساحلی قیام گاہ میں چلا جائے جو قرطاجنہ (Carthage) موجودہ تیونس میں واقع تھی، اب اس کے سامنے ملک کو بچانے کے بجائے اپنی ذات کو بچانے کا مسئلہ تھا۔۔۔۔۔۔شاہی کشتیاں محل کی خزانوں سے لادی جا چکی تھیں ،مگر عین وقت پر رومی کلیسا کے بڑے پادری نے اس کو مذہب کا واسطہ دے کر روکنے میں کامیابی حاصل کر لی، اور اس کو سینٹ صوفیا کی قربان گاہ پر لے گئے ،اور اس کو آمادہ کیا کہ وہاں وہ اس بات کا عہد کرے کہ وہ اپنی اس رعایا کے ساتھ جیئے گا یا مرے گا جس کے ساتھ خدا نے اس کو وابستہ کیا ہے،(صفحہ 75)اسی دوران میں ایرانی جنرل سین Saine نے تجویز کیا کہ ہرقل ایک صلح کا قاصد شہنشاہ ایران کی خدمت میں روانہ کرے، اس کو ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا، مگر جب شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے کہا:۔

''مجھ کو یہ نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہئے، میں رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا، جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر ہمارے سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے۔''(صفحہ 76)

تاہم چھ سالہ لڑائی نے بالآخر ایرانی حکمران کو مائل کیا کہ وہ فی الحال کچھ شرائط پر صلح

کر لے، اس نے شرط پیش کی۔

''ایک ہزار ٹالنٹ (۱) سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار ریشمی تھان،
ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار کنواری لڑکیاں۔''

گبن ان شرائط کو بجا طور پر شرم ناک شرائط Ignominious Terms کہتا ہے، ہرقل یقیناً ان شرائط کو قبول کر لیتا، مگر جتنی کم مدت میں اور جس چھوٹے سے لٹے ہوئے علاقہ سے اس کو ان قیمتی شرائط کی تکمیل کرنی تھی، اس کے مقابلے میں اس کے لئے زیادہ قابل ترجیح بات یہ تھی کہ وہ انھیں ذرائع کو دشمن کے خلاف آخری حملہ کی تیاری کے لئے استعمال کرے۔

ایک طرف یہ واقعات ہو رہے تھے، دوسری طرف ایران وروم کے درمیان عرب کے مرکزی مقام ''مکہ'' میں ان واقعات نے ایک اور کشمکش پیدا کر دی تھی، ایرانی سورج دیوتا کو مانتے تھے، اور آگ کی پرستش کرتے تھے، اور رومی وحی و رسالت کے ماننے والے تھے، اس لئے نفسیاتی طور پر اس جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں رومی عیسائیوں کے ساتھ تھیں اور مشرکین مظاہر پرست ہونے کی وجہ سے مجوسیوں سے اپنا مذہبی رشتہ جوڑتے تھے، اس طرح روم وایران کی کشمکش اس کشمکش کا ایک خارجی نشان بن گئی جو مکہ میں اہل اسلام اور کفار ومشرکین کے درمیان جاری تھی، دونوں گروہ سرحد پار کی اس جنگ کے انجام کو خود اپنی باہمی کشمکش کے انجام کی ایک علامت سمجھنے لگے، چنانچہ 616ء میں جب ایرانیوں کا غلبہ نمایاں ہو گیا اور رومیوں کے تمام مشرقی علاقے ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے، اور اس کی خبریں مکہ پہنچیں تو اسلام کے مخالفین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ دیکھو ہمارے بھائی تمھارے جیسا مذہب رکھنے والوں پر غالب آ گئے ہیں، اسی طرح اپنے ملک میں بھی ہم تم کو اور تمھارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے، مکہ کے مسلمان جس بے بسی اور کمزوری کی حالت میں تھے، اس میں یہ الفاظ ان کے لئے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے،

---

(۱) (Talent) یونانیوں اور رومیوں کا ایک قدیم وزن

عین اس حالت میں پیغمبر خدا کی زبان سے یہ الفاظ جاری کئے گئے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ (الروم 2-6)

ترجمہ: رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں مگر مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر وہ غالب آجائیں گے، پہلے اور پیچھے سب اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے، اور اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے وہ غالب اور مہربان ہے خدا کا وعدہ ہے خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

''اس وقت جب کہ یہ پیشین گوئی کی گئی'' گبن لکھتا ہے ''کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے'' (صفحہ 74) مگر ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی ایک ایسی ذات کی طرف سے کی گئی تھی، جو تمام ذرائع و وسائل پر تنہا قدرت رکھتا ہے، اور انسانوں کے دل جس کی مٹھی میں ہیں، چنانچہ ادھر خدا کے فرشتے نے ایک امی کی زبان سے یہ خبر دی اور ادھر ہرقل قیصر روم میں ایک انقلاب آنا شروع ہو گیا، گبن لکھتا ہے۔

''تاریخ کے نمایاں کرداروں میں سے ایک غیر معمولی کردار وہ ہے، جو ہرقل کے اندر ہم دیکھتے ہیں، اپنے لمبے دور حکومت کے ابتدائی اور آخری سالوں میں یہ شہنشاہ سستی، عیاشی اور اوہام کا بندہ دکھائی دیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی مصیبتوں کا ایک بے حس اور نامرد تماشائی ہے، مگر صبح و شام کا بے رونق کہر، دوپہر کے سورج سے کچھ دیر کے لئے چھٹ جاتا ہے، یہی حال ہرقل کا ہوا، محل کا آرکے ڈیس (۱)

(۱) آرکیڈیس (408-378) رومی سلطنت کا ایک تاجدار جو 395ء میں تخت نشین ہوا۔

Arcadius کا ایک میدان جنگ کا سیزر Caesar بن [۱] گیا، اور روم کی عزت چھ جرأت مندانہ مہموں کے ذریعہ حاصل کر لی گئی۔ یہ رومی مورخین کا فرض تھا کہ وہ حقیقت سے پردہ اٹھاتے اور اس کی اس خواب اور بیداری کے وجہ بیان کرتے، اتنے دنوں بعد اب ہم یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی سیاسی اسباب نہیں تھے، بلکہ یہ زیادہ تر اس کے شخصی جذبے کا نتیجہ تھا، اسی کے تحت اس نے اپنی تمام دلچسپیاں ختم کر دیں، حتیٰ کہ اپنی بھانجی (Martina) کو بھی چھوڑ دیا جس سے اس کو اس قدر تعلق تھا کہ محرم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اس نے شادی کر لی تھی۔''

Giboon, vol. v.p. 76-77

وہی ہرقل جس کی ہمت پست ہو چکی تھی، اور جس کا دماغ اس سے پہلے کچھ کام نہیں کرتا تھا، اب اس نے ایک نہایت کامیاب منصوبہ بنایا، قسطنطنیہ میں بڑے عزم وانہماک کے ساتھ جنگی تیاریاں شروع ہو گئیں، تاہم اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ 622ء میں جب ہرقل اپنی فوجیں لے کر قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ دنیا رومن امپائر کا آخری لشکر دیکھ رہی ہے۔

ہرقل جانتا تھا کہ ایرانی حکومت سمندری طاقت میں کمزور ہے، اس نے اپنے سمندری بیڑے کو پشت سے حملہ کے لئے استعمال کیا، اس نے اپنی فوجیں بحر اسود کے راستے سے گزار کر آرمینیا میں اتار دیں اور وہاں عین اس مقام پر ایرانیوں کے اوپر ایک بھرپور حملہ کیا، جہاں سکندر اعظم نے اس وقت کی ایرانی سلطنت کو شکست دی تھی جب اس نے شام سے مصر تک اپنا مشہور مارچ کیا تھا، ایرانی اس غیر متوقع حملہ سے گھبرا گئے اور ان کے قدم اکھڑ گئے، مگر ابھی وہ ایشیائے کوچک میں زبردست فوج رکھتے تھے، وہ دوبارہ اس فوج سے حملہ کرتے اگر ہرقل نے اس کے بعد شمال کی جانب سمندر سے اسی قسم کی دوسری غیر متوقع چڑھائی نہ کی ہوتی، پھر وہ سمندر کے راستہ سے قسطنطنیہ واپس آیا، آواریوں (Avars) سے

(۱) جولیس سیزر 44۔102 ق م) عظیم رومی فوجی اور سیاست داں۔

ایک معاہدہ کیااوران کی مدد سے ایرانیوں کوان کے دار السلطنت کے گردروک دیا،ان دوحملوں کے بعداس نے مزید تین مہمیں جاری کیں۔۔۔۔۔۔۔623ء میں،624ء میں اور 625ء میں یہ مہمیں بحر اسود کے جنوبی ساحل سے حملہ آور ہوکرایرانی قلمرو میں گھسیں اور میسو پوٹا میا تک پہنچ گئیں،اس کے بعد ایرانی جارحیت کا زورٹوٹ گیا،اورتمام رومی علاقے ایرانی فوجوں سے خالی ہو گئے،اب ہرقل خودایرانی شہنشاہیت کے قلب پرحملہ کرنے کی پوزیشن میں تھا،تاہم آخری فیصلہ کن جنگ دجلہ کے کنارے نینوا کے مقام پر دسمبر 627ء میں ہوئی۔

اب خسروکی ہمت چھوٹ گئی تھی ،وہ اپنے محبوب محل ''دستگرد'' سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگا،مگراسی دوران میں خوداس کے محل کے اندراس کے خلاف بغاوت ہوگئی،اس کے لڑکے شیرویہ نے اس کوگرفتارکر کے ایک تہہ خانے میں بندکر دیا جہاں وہ پانچویں دن بیکسی کی حالت میں مرگیا،اس کے اٹھارہ لڑکوں کواس کی آنکھ کے سامنے قتل کر دیا گیا،مگراس کا یہ لڑکا بھی آٹھ مہینے تخت پر رہ سکا،اس کے بعددوسرے شہزادے نے اس کوقتل کرکے تاج پر قبضہ کرلیا،اس طرح شاہی خاندان کے اندرآپس میں تلواریں چلنا شروع ہوگئیں، یہاں تک کہ چارسال میں نو بادشاہ بدلے گئے،ان حالات میں ظاہرہے کہ ازسرنورومیوں کا مقابلہ کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا،خسرو پرویز کے بیٹے قباد ثانی نے رومی مقبوضات سے دست بردار ہوکرصلح کرلی،مقدس صلیب کی اصل لکڑی واپس کردی گئی،اورمارچ 628ء میں فاتح ہرقل اس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے،اور بے شمارلوگ دار السلطنت کے باہر لیمپوں اورزیتون کی شاخوں کو لئے ہوئے اپنے ہیرو کے استقبال کے لئے موجود تھے۔(صفحہ 94)

اس طرح قرآن نے رومیوں کے دوبارہ غلبہ کے متعلق جوپیشین گوئی کی تھی وہ ٹھیک اپنے وقت پر(دس سال کےاندر)مکمل طور پر پوری ہوگئی۔

گبن نے اس پیشین گوئی پر حیرت کا اظہار کیا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کی اہمیت گھٹانے کے لئے اس نے بالکل غلط طور پر اس کو خسرو کے نام آپ کے دعوت نامے کے ساتھ جوڑ دیا ہے، وہ لکھتا ہے۔

''ایرانی شہنشاہ نے جب اپنی فتح مکمل کر لی تو اس کو مکہ کے ایک گمنام شہری کا خط ملا جس میں اس کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ محمدؐ کو خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرے، اس نے دعوت کو نامنظور کر دیا اور خط کو چاک کر دیا، رسول عربی کو جب یہ خبر ملی تو انھوں نے کہا'' خدا اسی طرح خسرو کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور اس کی طاقت کو برباد کر دے گا۔'' مشرق کی دو عظیم سلطنتوں کے عین کنارے بیٹھے ہوئے محمدؐ ان دونوں حکومتوں کی باہمی تباہی سے اندر ہی اندر خوش ہوتے رہے اور ایرانی فتوحات کے عین وسط میں انھوں نے پیشینگوئی کرنے کی جرأت کی کہ چند سال کے بعد فتح دوبارہ رومیوں کے جھنڈے کی طرف لوٹ آئے گی، اس وقت جبکہ یہ پیشین گوئی کی گئی ،کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید وقوع نہیں ہوسکتی تھی ، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔''

(Gibbom.vol.p.73.74)

مگر اسلامی تاریخ کا ہر مورخ جانتا ہے کہ اس پیشین گوئی کا خسرو کے نام دعوت نامے سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ شہنشاہ ایران کے نام اسلام کا دعوت نامہ ہجرت کے ساتویں سال صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا گیا ہے، جو سَن عیسوی کے لحاظ سے 628ء ہوتا ہے، جبکہ پیشین گوئی ہجرت سے پہلے مکہ میں 216ء میں نازل ہوئی تھی۔ (۱)

3۔ قرآن کی تیسری خصوصیت جس کو میں اس کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتا

---

(۱) اعجاز قرآن پر انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مندرجہ ذیل حصے قابل ملاحظہ ہیں۔
مقالہ (Quran) ج۔ ا ص، 54، 541، 545

ہوں، وہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن باوجودیکہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا،اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہوسکی،اگر یہ صرف ایک انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔

چین کے نوجوان طلبہ کی ایک جماعت جو حکومت کے زیراہتمام کیلی فورنیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہی تھی،ان میں سے تقریباً بارہ افراد نے برکلے کے گرجا گھر میں جاکر پادری سے کہا کہ وہ ان کے لئے اتوار کے ایک کلاس کا انتظام کرے،چینی نوجوان نے نہایت صفائی سے کہا کہ انھیں ذاتی طور پر عیسائیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے،اور نہ وہ خود عیسائی بننا چاہتے ہیں،البتہ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مذہب نے امریکی تمدن پر کیا اور کتنے اثرات ڈالے ہیں،پادری نے اس جماعت کی ہفتہ وار تعلیم کے لئے ریاضیات اور فلکیات کے ایک عالم (Peter W.Stoner) کو مقرر کیا،اس واقعہ کے چار مہینے بعد تمام نوجوانوں نے عیسائیت قبول کرلی،اس غیر معمولی تبدیلی کی وجہ کیا تھی،اس کو خود معلم کی زبان سے سنئے:۔

''میرے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کے سامنے مذہب کی کون سی بات رکھی جائے،کیونکہ یہ نوجوان بائبل پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے،بائبل کی محض رواجی تعلیم بے فائدہ معلوم ہوتی تھی،اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا،میں نے اپنی تعلیم کے زمانے میں بائبل کے پہلے باب (کتاب پیدائش)اور سائنس میں بہت قریبی مناسبت پائی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ اس جماعت کے سامنے یہی بات پیش کروں۔

میں اور طلبہ قدرتی طور پر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کائنات کی پیدائش کے متعلق یہ مواد زمین وآسمان کے بارے میں سائنس کی موجودہ معلومات حاصل ہونے سے ہزاروں سال پہلے لکھا گیا ہے،ہمیں یہ بھی حساس تھا کہ موسیٰ کے زمانے میں کائنات کے متعلق لوگوں کے جو خیالات تھے،اس کو موجودہ زمانے کی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ نہایت لغو معلوم ہوں گے۔

ہم نے پورا موسم سرما کتاب پیدائش کے پہلے باب میں گزار دیا، طلبہ کام لے کر یونیورسٹی کی لائبریری میں چلے جاتے اور بڑی محنت کے ساتھ جوابات تیار کر کے لاتے، موسم سرما کے خاتمہ پر پادری نے مجھے بتایا کہ طلبا کی پوری جماعت اس کے پاس یہ کہنے کے لئے آئی تھی کہ وہ عیسائی بننا چاہتے ہیں، نھوں نے اقرار کیا کہ ان کے اوپر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بائبل خدا کی الہامی کتاب ہے۔"

The Evidence of God , p.137-138

مثال کے طور پر زمین کی ابتدا کے بارے میں کتاب پیدائش کا فقرہ ہے:۔

"گہرائیوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔"

یہ موجودہ معلومات کے مطابق اس وقت کی بہترین تصویر ہے، جب زمین ابھی گرم تھی اور اس کی گرمی کی وجہ سے پانی بخارات بن کر اڑ گیا تھا، اس وقت ہمارے تمام سمندر کثیف بادلوں کی شکل میں فضا میں معلق تھے، اور اس کی وجہ سے روشنی زمین کی سطح تک نہیں پہونچ پاتی تھی۔

ہمارا ایمان ہے کہ انجیل اور تورات اصلاً اسی طرح خدا کی کتابیں ہیں، جیسے قرآن خدا کی کتاب ہے، اس لئے ان میں علم الٰہی کے شرارے بلاشبہ موجود ہیں، مگر ان کتابوں کے اصل الفاظ محفوظ نہیں رہے، ہزاروں برس گزرنے کے بعد بائبل اب ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب کی شکل میں ہے، جس میں کریسی ماریسن کے الفاظ میں ترجمہ (Translation) اور انسانی الحاق (Human Interpolation) کی وجہ سے اصل خدائی نسخہ کے مقابلے میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے [۱] اس طرح یہ صحیفے پوری شکل میں اصل حیثیت کو کھو چکے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو منسوخ کر کے ہمارے لئے اپنی کتاب کا تصحیح شدہ اڈیشن (قرآن) نازل کیا، قرآن اپنی صحت اور جامعیت کی وجہ سے بدرجہ

---

(۱) Man Does not stand Alone, p.120

اتم ان خصوصیات کا حامل ہے، جن کی صرف ایک جھلک اب کتب قدیمہ میں باقی رہ گئی ہے۔

یہاں میں قرآن کی اسی خصوصیت کو اس کی صداقت کی تیسری دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں قرآن باوجودیکہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہوسکی، اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن ایک ایسے زمانے میں اترا جب انسان عالم فطرت کے بارے میں بہت کم جانتا تھا، اس وقت بارش کے متعلق یہ تصور تھا کہ آسمان میں کوئی دریا ہے، جس سے پانی بہہ کر زمین پر گرتا ہے، اور اسی کا نام بارش ہے، زمین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ چپٹی فرش کی مانند ہے، اور آسمان اس کی چھت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر کھڑی کی گئی ہے، ستاروں کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ چاندی کی چمکتی ہوئی کیلیں ہیں، جو آسمان کے گنبد میں جڑی ہوئی ہیں یا وہ چھوٹے چھوٹے چراغ ہیں، جو رات کے وقت رسیوں کی مدد سے لٹکائے جاتے ہیں، قدیم اہل ہند یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک گائے کی سینگ پر ہے، اور جب گائے زمین کو ایک سینگ سے دوسری سینگ پر منتقل کرتی ہے تو اس کے سر کی جنبش سے زلزلہ آجاتا ہے، کوپرنیکس 1543ء۔ 1473ء) تک یہ نظریہ تھا کہ سورج ساکن ہے، اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

اس کے بعد علم کی ترقی ہوئی، انسان کے مشاہدے اور تجربے کی قوت بڑھ گئی جس کی وجہ سے بے شمار نئی نئی معلومات حاصل ہوئیں، زندگی کا کوئی شعبہ اور علم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس میں پہلے کے مسلمات بعد کی تحقیق سے غلط ثابت نہ ہوئے ہوں____اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا کوئی بھی انسانی کلام ایسا نہیں ہوسکتا جو آج بھی اپنی

صحت کو پوری طرح باقی رکھے ہوئے ہو ـــــــ کیونکہ آدمی اپنے وقت کی معلومات کی روشنی میں بولتا ہے، وہ شعور کے تحت بولے یا لاشعور کے تحت، بہر حال وہ وہی کچھ دہرائے گا ، جواس نے اپنے زمانہ میں پایا ہو، چنانچہ دیڑھ ہزار برس پہلے کوئی بھی انسانی کتاب آج ایسی موجود نہیں ہے، جو غلطیوں سے پاک ہو ـــــــ مگر قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ جس طرح دیڑھ ہزار برس پہلے کے دور میں برحق تھا، آج بھی وہ اسی طرح برحق ہے، زمانے کے گزرنے سے اس کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ واقعہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جس کی نگاہ ازل سے ابد تک محیط ہے ـــــــ جو سارے حقائق کو اپنی اصل شکل میں جانتا ہے، جس کی واقفیت زمانے اور حالات کی پابند نہیں اگر یہ محدود نظر رکھنے والے انسان کا کلام ہوتا تو بعد کا زمانہ اسی طرح اس کو غلط ثابت کر دیتا، جیسے ہر انسانی کلام بعد کے زمانے میں غلط ہو چکا ہے۔

قرآن کا اصل موضوع اخروی سعادت ہے، اس لحاظ سے وہ دنیا کے معروف علوم و فنون میں سے کسی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر اس کا مخاطب چونکہ انسان ہے، اس لئے قدرتی طور پر وہ اپنی تقریروں میں ہر اس علم مس کرتا ہے جس کا تعلق انسان سے ہے، یہ ایک بہت نازک صورت حال ہے کیونکہ آدمی اپنی گفتگو میں اگر کسی فن کو مس کر رہا ہے تو خواہ وہ اس پر کوئی تفصیلی کلام نہ کرے، اگر اس کی معلومات ناقص ہیں، تو یقینی طور پر وہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو صورت واقعہ سے ٹھیک مطابقت نہ رکھتے ہوں، مثلاً ارسطو نے عورت کی کمتری ثابت کرنے کے لئے یہ کہا کہ ـــــــ ’اس کے منہ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔‘‘ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ علم الاجسام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، مگر اس کے باوجود وہ ایک ایسا فقرہ ہے جو علم الاجسام سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ مرد اور عورت کے منہ میں دانت کی تعداد یکساں ہوتی ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن اگرچہ اکثر علوم انسانی کو کہیں نہ کہیں مس کرتا ہے، مگر اس کے بیانات میں کوئی ایک بات بھی

ایسی نہیں آنے پائی جو بعد کی وسیع تر تحقیقات سے یہ ثابت کرے کہ یہ ایسے شخص کا کلام ہے، جس نے کم تر معلومات کی روشنی میں اپنی باتیں کہیں تھیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بالاتر ہستی کا کلام ہے، جو اس وقت بھی جانتا تھا، جب کوئی نہیں جانتا تھا، اور ان چیزوں کو بھی جانتا تھا، جس سے اب تک لوگ ناواقف ہیں۔

یہاں میں مختلف علوم سے متعلق چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک علم مس کرتے ہوئے بھی قرآن کس طرح حیرت انگیز طور پر ان صداقتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، جو قرآن کے نزول کے وقت معلوم شدہ نہیں تھیں، بلکہ بعد کو دریافت ہوئیں۔

اس بحث سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جدید تحقیقات سے قرآنی الفاظ کی مطابقت اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ یہ تحقیقات متعلقہ واقعہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو چکی ہیں، اور اس طرح مادی کائنات کے بارے میں قرآن کے اشاراتی الفاظ کی تفسیر کے لئے ہم کو ضروری مواد حاصل ہو گیا ہے، اب اگر مستقبل کا مطالعہ کسی موجودہ تحقیق کو کلاً یا جزءاً غلط ثابت کر دے تو اس سے کسی بھی درجہ میں قرآن کی تغلیط نہیں ہوگی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ قرآن کے مجمل اشارہ کے تفصیلی تعین میں غلطی ہو گئی تھی، ہم کو یقین ہے کہ آئندہ کی صحیح تر معلومات قرآن کے اشاراتی الفاظ کو زیادہ صحیح طور پر واضح کرنے والی ہوں گی، وہ کسی اعتبار سے اس سے مختلف نہیں ہو سکتیں۔

اس سلسلے میں قرآن کے جو بیانات ہیں، ان کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جو ان امور سے متعلق ہے، جن کے متعلق انسان کو نزول قرآن کے وقت کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اور دوسرے وہ جن کے متعلق وہ سطحی اور ظاہری معلومات رکھتا تھا۔

کائنات کی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے متعلق دورِ سابق کے لوگ کچھ نہ کچھ جانتے تھے _____ مگر ان کا یہ علم ان دریافتوں کے مقابلے میں بے حد ناقص اور ادھورا تھا، جو بعد کے علمی ترقی کے دور میں انسان کے سامنے آئیں، قرآن کی مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی سائنسی

کتاب نہیں تھی، اس لئے اگر وہ عالم فطرت کے بارے میں یکا یک نئے نئے انکشافات لوگوں کے سامنے رکھنا شروع کر دیتا تو انھیں چیزوں پر بحث چھڑ جاتی اور اس کا اصل مقصد ــــ ذہن کی اصلاح ــــ پس پشت چلا جاتا، یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے علمی ترقی سے بہت پہلے کے زمانے میں اس طرح کی چیزوں پر کلام کیا، اور ان کے بارے میں ایسے الفاظ ستعمال کئے جس میں دورِ سابق کے لوگوں کے لئے توحش کا کوئی سامان نہیں تھا، اور اسی کے ساتھ بعد کے انکشافات کا بھی وہ پوری طرح احاطہ کئے ہوئے تھے۔

الف: قرآن میں دو مقامات پر پانی کا ایک خاص قانون بیان کیا گیا ہے، اول سورۂ فرقان میں، دوسرے سورۂ رحمان میں:۔

اول الذکر اقتباس حسب ذیل ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ (الفرقان)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے ملائے دو دریا، ایک کا پانی میٹھا خوش گوار ہے اور ایک کا کھاری تلخ، اور دونوں کے درمیان ایک آڑ رکھ دی۔

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ (الرحمن 19۔20) ترجمہ: اس نے چلائے دو دریا ملتے ہوئے دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے، جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے۔

ان آیات میں جس مظہر قدرت کا ذکر ہے، وہ قدیم ترین زمانے سے انسان کو معلوم تھا، وہ یہ کہ دو دریاؤں کے پانی باہم مل کر بہتے ہیں تو وہ ایک دوسرے میں شامل نہیں ہو جاتے مثال کے طور پر چاٹگام (بنگلہ دیش) سے لے کر ارکان (برما) تک دو دریا مل کر بہتے ہیں، اور اس پورے سفر میں دونوں کا پانی بالکل الگ الگ نظر آتا ہے، دونوں کے بیچ میں ایک

دھاری سی برابر چلی گئی ہے، ایک طرف کا پانی میٹھا اور دوسری طرف کا کھاری، اسی طرح سمندر کے ساحلی مقامات پر جو دریا بہتے ہیں، ان میں سمندر کے اثر سے برابر مدوجزر (جوار بھاٹا) آتا رہتا ہے، مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے، لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے اوپر کھاری رہتا ہے، نیچے میٹھا، اس کے بعد جب جزر ہوتا ہے تو اوپر سے کھاری پانی اتر جاتا ہے، اور میٹھا پانی جوں کا توں رہتا ہے، الٰہ آباد میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے مقام پر میں نے خود دیکھا کہ دونوں دریا ملنے کے باوجود الگ الگ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور درمیان میں ایک لکیر مسلسل چلی گئی ہے۔

یہ بات قدیم ترین زمانے سے انسان کے مشاہدے میں آچکی ہے، مگر یہ واقعہ کس قانون فطرت کے تحت واقع ہوتا ہے، یہ ابھی حال میں دریافت کیا گیا ہے، جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ رقیق اشیا میں سطحی تناؤ (Surface Tension) کا ایک خاص قانون ہے، اور یہی دونوں قسم کے پانی کو الگ الگ رکھتا ہے ـــــ چونکہ دونوں سیالوں کا تناؤ (Tension) مختلف ہوتا ہے، اس لئے وہ دونوں کو اپنی اپنی حد میں روکے رہتا ہے، آج کل اس قانون کو سمجھ کر جدید دنیا نے بے شمار فوائد حاصل کئے ہیں، قرآن ''(بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴿٢٠﴾ الرحمٰن)'' کے مطابق الفاظ بول کر اس واقعہ کی ایسی تعبیر کی جو قدیم مشاہدے کے اعتبار سے بھی ٹکرانے والی نہیں تھی، اوراب جدید دریافت پر بھی وہ پوری طرح حاوی ہے، کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برزخ (آڑ) سے مراد سطح کا تناؤ (Surface Tension) ہے، جو دونوں قسم کے پانی کے درمیان پایا جاتا ہے، اور جو دونوں کو مل جانے سے روکے ہوئے ہے۔

سطحی تناؤ کے قانون کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھئے، اگر آپ گلاس میں پانی بھریں تو وہ کنارے تک پہنچ کر فوراً بہنے نہیں لگے گا، بلکہ ایک سوت کے بقدر اٹھ کر گلاس کے کناروں

کے اوپر گولائی میں ٹھہر جائے گا، یہی وہ چیز ہے جس کو شاعر نے ''خط پیمانہ'' کہا ہے۔

انداز ۂ ساقی تھا کس درجہ حکیمانہ

ساغر سے اٹھیں موجیں بن کر خط پیمانہ

گلاس کے کناروں کے اوپر پانی کی جو مقدار ہوتی ہے، وہ کیسے ٹھہرتی ہے، بات یہ ہے کہ رقیق اشیا کی سطح کے سالمات Molecules کے بعد چونکہ کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے ان کا رخ اندر کی طرف ہو جاتا ہے، اس طرح کے سالمات کے درمیان کشش اتصال بڑھ جاتی ہے، اور قانون اتصال (Cohesion) کے عمل کی وجہ سے پانی کی سطح کے اوپر ایک قسم کی لچک دار جھلی (Elastic Film) سی بن جاتی ہے، اور پانی گویا اس کے غلاف میں اس طرح ملفوف ہو جاتا ہے، جیسے پلاسٹک کی سفید جھلی میں پسا ہوا نمک ملفوف ہوتا ہے، سطح کا یہی پردہ اوپر ا بھرے ہوئے پانی کو روکتا ہے، یہ پردہ اس حد تک قوی ہوتا ہے کہ اگر اس کے اوپر سوئی ڈال دی جائے تو وہ ڈوبے گی نہیں بلکہ پانی کی سطح پر تیرتی رہے گی، اسی کو سطحی تناؤ کہا جاتا ہے، اور یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر تیل اور پانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے اور یہی وہ ''آڑ'' ہے جس کی وجہ سے کھاری پانی اور میٹھے پانی کے دو دریا مل کر بہتے ہیں مگر ایک کا پانی دوسرے میں شامل نہیں ہوتا۔

ب: ارشاد ہوا ہے۔

اللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (الرعد۔2)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا، بغیر ایسے ستونوں کے جنھیں تم دیکھ سکو۔

دورِ قدیم کے انسان کے لئے یہ الفاظ اس کے ظاہری مشاہدے کے عین مطابق تھے، کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے سر کے اوپر سورج، چاند اور ستاروں کی ایک دنیا کھڑی ہے، مگر کہیں اس کا پایہ اور کھمبا نظر نہیں آتا اور اب جدید ترین معلومات رکھنے والے انسان کے لئے بھی اس میں مکمل معنویت موجود ہے، کیونکہ جدید ترین مشاہدہ بتاتا ہے کہ اجرام سماوی ایک

لامحدود خلا میں بغیر کسی سہارے کے قائم ہیں، اور ایک ''عمد غیر مرئی'' یعنی کشش ثقل (Gravitational Pull) ان کو بالائی فضا میں سنبھالے ہوئے ہے۔

ج: اسی طرح سورج اور تمام ستاروں کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (الانبیاء:33)

سب کے سب ایک آسمان میں تیر رہے ہیں۔

دور قدیم میں بھی انسان اجرام سماوی کو حرکت کرتا ہوا دیکھتا تھا، اس لئے ان الفاظ سے اس کو توحش نہیں ہوا، مگر جدید معلومات نے ان الفاظ کو اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے، بسیط اور لطیف خلا میں اجرام سماوی کی گردش کے لئے ''تیرنے'' سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔

د: رات اور دن کے متعلق قرآن میں ہے:۔

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا (الاعراف:54)

اللہ اوڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔

یہ قدیم انسان کے لئے صرف رات دن کی ظاہری آمد و شد کو بتاتے تھے، مگر اس میں نہایت عمدہ اشارہ زمین کی محوری گردش کی طرف بھی موجود ہے، جو جدید مشاہدے کے مطابق رات اور دن کی تبدیلی کی اصل وجہ ہے، یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ روس کے پہلے خلائی مسافر نے خلا سے واپسی کے بعد اپنے جو مشاہدات بیان کئے تھے، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ زمین کو اس نے اس شکل میں دیکھا کہ سورج کے سامنے محوری گردش کی وجہ سے اس کے اوپر اندھیرے اور اجالے کی آمد و رفت کا ایک تیز تسلسل Rapid Succession جاری تھا۔

اس طرح کے بیانات قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔

دوسری مثالیں وہ ہیں، جن کے متعلق پچھلے زمانے کے لوگ قطعاً کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے، قرآن نے ان کا ذکر کیا، اور ایسی باتیں کہیں جو حیرت انگیز طور پر جدید انکشافات سے صحیح ثابت ہوتی ہیں، یہاں میں مختلف علمی شعبوں سے اس کی چند مثالیں پیش کروں گا۔

فلکیات

قرآن نے مادی کائنات کے آغاز وانجام کا ایک خاص تصور دیا ہے، یہ تصور سو برس پہلے تک انسان کے لئے بالکل نامعلوم تھا اور نزول قرآن کے زمانے میں تو اس کا تصور بھی کسی ذہن میں نہیں گزر سکتا تھا۔ مگر جدید مطالعہ نے حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کی ہے، آغاز کائنات کے بارے میں قرآن کا بیان یہ ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا (۱) فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ

(انبیاء:30)

کیا منکرین نہیں دیکھتے کہ زمین وآسمان ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اس کو پھاڑ دیا۔

اور اس کا انجام یہ بتایا گیا ہے:۔

يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَىِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ (الانبیاء:104)

اس دن لپیٹ دیں گے ہم آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں طومار میں کاغذ۔

ان الفاظ کے مطابق کائنات ابتداءً ایک سمٹی ہوئی حالت میں تھی، اور اس کے بعد پھیلنا شروع ہوئی، اس پھیلاؤ کے باوجود اس کا اصل مادہ اتنا کم ہے کہ تھوڑی سی جگہ میں اس کو دوبارہ سمیٹا جا سکتا ہے۔

کائنات کے بارے میں جدید ترین تصور یہی ہے، مختلف قرائن اور مشاہدات کی بنیاد پر سائنسداں اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ابتدا میں کائنات کا مادہ جامد اور سکون کی حالت میں تھا، یہ ایک بہت ہی سخت سکڑی ہوئی اور گھٹی ہوئی انتہائی گرم گیس تھی، تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک زبردست دھماکے سے وہ پھٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹوٹے

---

(۱) رتق۔ مُنضم الاجزاء

ہوئے اجزاء چاروں طرف پھیلنے لگے، جب ایک بار پھیلاؤ شروع ہوگیا تو اس کا جاری رہنا لازمی تھا، کیونکہ اجزائے مادی جیسے جیسے دور ہوں گے، ان کا باہمی کشش کا اثر ایک دوسرے پر کم ہوتا جائے گا، آغاز میں کائنات کا جو مادہ تھا، اس کے مکانی دائرہ کا اندازہ تقریباً ایک ہزار سال نور ہے اور اب پروفیسر ایڈنگٹن کے اندازے کے مطابق وہ سابقہ دائرہ کے مقابلے میں تقریباً دس گنا بڑھ چکا ہے، یہ عمل توسیع اب بھی جاری ہے، ایڈنگٹن کے الفاظ میں:۔

> ''ستاروں اور کہکشاؤں کی مثال ایک ایسے ربر کے غبارے کی سطح کے نشانات کی سی ہے جو مسلسل پھیل رہا ہو، اسی طرح اپنی ذاتی حرکت کے ساتھ تمام آسمانی کرے کائناتی پھیلاؤ کے ساتھ ہر آن دور ہوتے جارہے ہیں۔''

The Limitations of Science, p. 20

دوسری بات بھی جدید ترین مطالعہ سے کائنات کے ڈھانچے کے عین مطابق ثابت ہوئی ہے، قدیم انسان یہ سمجھتا تھا کہ ستارے اتنے ہی فاصلوں پر ہیں جیسے کہ وہ بظاہر نظر آتے ہیں، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ دوری کی وجہ سے قریب قریب نظر آتے ہیں، ورنہ وہ ایک دوسرے سے بے انتہا بعید فاصلے پر واقع ہیں، اور یہی نہیں بلکہ وہ اجسام جو بظاہر سالم نظر آتے ہیں، ان کا بھی ایک بڑا حصہ درحقیقت خلا ہے، جس طرح شمسی نظام میں بہت سے سیارے اور سیارچے ایک دوسرے سے دور دور فاصلوں پر رہتے ہوئے ایک نظام کے تحت گردش کرتے ہیں، اسی طرح ہر مادی جسم چھوٹے پیمانے کے بے شمار شمسی نظاموں کا مجموعہ ہے جن کو ''ایٹم'' کہتے ہیں، نظام شمسی کا خلا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں، مگر ایٹمی نظام کا خلا، انتہائی چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا (۱) گویا ہر چیز، خواہ وہ بظاہر ٹھوس نظر آرہی ہو، اندر سے کھوکھلی ہے، مثلاً چھ فٹ لمبے چوڑے انسانی جسم کے مادی ذرات کے درمیان

---

(۱) ایٹم کی ساخت کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص 26

سے اگر خلا یا مکان (Space) کو نکال دیا جائے تو باقی ماندہ مادہ کی بساط بس ایک غیر مرئی دھبہ کی سی رہ جائے گی۔

اسی طرح فلکی طبیعیات کے ماہرین (Astrophysicists) نے کائنات میں پھیلے ہوئے پورے مادہ کا حساب لگایا ہے، ان کا کہنا ہے۔

"If all this were squeezed without leaving any space,the size of the universe will be only thirty times the size of the sun."

یعنی اگر سارے کائنات کو اس طرح سمیٹ دیا جائے کہ اس میں خلا باقی نہ رہے تو ساری کائنات کا حجم موجودہ سورج سے صرف 30 گنا زیادہ ہوگا، جبکہ کائنات کی وسعت کا یہ حال ہے کہ شمسی نظام سے بعید ترین کہکشاں جو اب تک دیکھی جا سکی ہے، وہ سورج سے کئی ملین سال نور کے فاصلے پر واقع ہے۔

2۔ دورِ جدید کے ماہرین فلکیات اپنے مشاہدے اور ریاضیاتی اندازے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اجرام سماوی جس قانون کے تحت گردش کر رہے ہیں، اس کے مطابق مستقبل بعید میں ایک وقت آنے والا ہے، جب چاند زمین کے بہت قریب آجائے گا، اور دوطرفہ کشش کی تاب نہ لاکر پھٹ جائے گا اور اس کے ٹکڑے زمین کے گرد فضا میں پھیل جائیں گے۔

Man does not Stand Alone. p.34

''شق قمر'' کا یہ واقعہ اسی قانون کشش کے تحت ہوگا، جس کا مظاہرہ جوار بھاٹے کی شکل میں سمندروں میں ہوتا رہتا ہے، چاند بالائی فضا میں ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے، یعنی زمین سے اس کا فاصلہ صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے، اس قربت کی وجہ سے اس کی کشش کا اثر

سمندروں پر پڑتا ہے، اوردن میں دوبار پانی اوپراٹھ کر غیر معمولی تموج پیدا کرتا ہے، یہ موجیں بعض مقامات پر ساٹھ فٹ کے قریب اوپر تک اٹھ جاتی ہیں، اور خشکی کی سطح بھی اس قمری کشش سے چندانچ تک متاثر ہوتی ہے، چانداورزمین کا موجودہ فاصلہ بہت مناسب مقدار پر ہے، اوراس کے بہت سے فوائد ہیں، اس کے بجائے اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے مثلاً پچاس ہزار میل پر آجائے توسمندروں میں اس شدت سے طوفان برپا ہوکہ خشکی کا بیشتر حصہ اس میں غرق ہوجائے اورطوفانی موجوں کے مسلسل ٹکراؤ سے پہاڑ کٹ کر ریزے ریزے ہوجائیں، اورزمین اس کی کشش سے پھٹنے لگے۔

ماہرین فلکیات کا اندازہ ہے کہ زمین کی ابتدائی پیدائش کے وقت چانداسی طرح زمین کے قریب تھا، اوراس وقت زمین کی سطح پر یہ سب کچھ ہوچکا ہے، اس کے بعد فلکیاتی قانون نے اسے موجودہ دوری پر پہنچادیا، ان کا خیال ہے کہ ایک ملین سال تک یہ صورت باقی رہے گی، اوراس کے بعد یہی فلکی قانون دوبارہ چاندکوزمین کے قریب لائے گا، اوراس وقت چانداورزمین کی باہمی کشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چاند پھٹ جائے گا اورٹکڑے ہوکر زمین کے گرد ایک حلقہ کی شکل میں پھیل جائے گا۔

یہ نظریہ حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق ہے، جو سورۂ قمر میں وارد ہے، یعنی قیامت جب قریب آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا اوراس کا پھٹنا قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہوگا۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② (القمر 1۔2)

ترجمہ: قیامت نزدیک آگئی اور چاند پھٹ گیا اور یہ لوگ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو سدا سے

چلا آ رہا ہے۔ (۱)

ارضیات

پہاڑوں کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ وہ زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ہیں، مثلاً فرمایا:۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (لقمان:10)

ترجمہ: اور زمین میں پہاڑ بنا دیئے، تاکہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔

ان الفاظ کے نزول کے پورے تیرہ سو برس تک انسانی علم پہاڑوں کی اس حیثیت کے بارے میں بالکل بے خبر تھا، مگر اب جغرافیہ اس سے آشنا ہو چکا ہے، اور جدید جغرافی اصطلاح میں اس کو توازن (Isostasy) کہا جاتا ہے اگرچہ اس سلسلے میں انسان کا علم ابھی ابتدائی منزل میں ہے، تاہم انگلن کے الفاظ میں ''یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین کی سطح پر جو ہلکا مادہ تھا، وہ پہاڑوں کی شکل

(۱) شق قمر کا واقعہ صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں مستند روایات سے بیان کیا گیا ہے، ان راویوں میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بھی ہیں، جو بذات خود اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں، اس کے باوجود شق قمر کا مسئلہ قدیم مفسرین و متکلمین سے لے کر اب تک شدید بحث کا موضوع رہا ہے، اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہ شق قمر کا واقعہ ہوا ہے، اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قیامت کے قریب ہوگا (قال بعض المفسرین سینشق ،تفسیر کبیر) اس دوسرے گروہ میں امام حسن بصری بھی شامل ہیں جن کا قول ابوحیان اندلسی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ان المعنی اذاجاء ت الساعة انشق القمر بعدالنفخة الثانية (البحر المحیط، جلد ثامن، صفحہ 173) ''اقتربت الساعة و انشق القمر'' کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قریب آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا اور یہ واقعہ دوسری بار صور پھونکے جانے کے بعد ہوگا۔

ان دونوں خیالات میں تطبیق کی سورت بعض لوگوں نے یہ نکالی ہے کہ انھوں نے ان دونوں کو تسلیم کر لیا ہے، ان کے خیال کے مطابق احادیث میں منیٰ کے ایک مجمع کے سامنے جس شق قمر کا ذکر ہے، وہ بھی ایک واقعہ ہے خواہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق بصری تصرف کے تحت ہوا ہو، یا فی الواقع کوئی فلکیاتی انشقاق ہو، اور قیامت کے قریب شق قمر کی بات بھی صحیح ہے پہلا واقعہ گویا ایک ابتدائی علامت ہے، اس واقعہ کی جو قرب قیامت میں آخری شکل میں ظاہر ہوگا، علامہ شبیر عثمانی لکھتے ہیں:

''شق القمر کا معجزہ ایک نمونہ اور نشانی تھی، قیامت کی کہ آگے سب کچھ یوں ہی پھٹے گا۔''

میں ابھرا آیا اور جو بھاری مادہ تھا، وہ گہری خندقوں کی صورت میں دب گیا جن میں اب سمندر کا پانی بھرا ہوا ہے، اس طرح ابھار اور دباؤ نے مل کر زمین کا توازن برقرار رکھا ہے۔"(۱)

ایک اور مصنف لکھتا۔

"جیسے خشکی پر وادیاں ہیں ،اسی طرح سمندر کے نیچے بھی وادیاں ہیں، مگر سمندر کی تہہ کی اکثر وادیاں زیادہ گہری اور انسان کے تجرباتی دائرہ کے لحاظ سے بہت دور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر معمولی دباؤ سے سمندروں میں گہرے غار ہو گئے ہیں (یہ وادیاں سمندر سے 34ہزار فٹ تک گہری ہیں، یہ گہرائی کسی بھی پہاڑ کی بلندی سے زیادہ ہے، بعض مقامات پر یہ گھاٹیاں اتنی گہری ہیں کہ اگر زمینی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ماونٹ ایورسٹ کو جو 29002فٹ بلند ہے، وہاں ڈال دیا جائے تو اس کے اوپر ایک میل کی اونچائی تک پانی بہتا رہے گا) حیرت یہ ہے کہ یہ سمندری خندقیں (Oceanic trenches) دو سمندر کے درمیان واقع ہونے کے بجائے خشکی کے قریب قریب پائی جاتی ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا عظیم دباؤ تھا، جس نے سمندر کی تہہ میں یہ زبردست غار پیدا کر دیئے ،مگر جزائری سلسلوں اور آتش فشاں پہاڑوں سے ان کی قربت ظاہر کرتی ہے کہ پہاڑی بلندیوں اور سمندری خندقوں میں کوئی باہمی تعلق ہونا چاہئے، گویا کہ زمین اونچائی اور گہرائی کے ذریعہ اپنے توازن (Balance) کو قائم رکھتی ہے، جغرافیہ کے بعض مستند علماء کا خیال ہے کہ سمندری گہرائیاں آئندہ ابھرنے والے خشکی کی علامتیں ہوسکتی ہیں، کیونکہ پانی کے نیچے ان اندھیرے غاروں میں صدیوں سے بہہ بہہ کر خشکی اور سمندر کی تہہ کی گاد (Sediment) تہہ بتہہ جمع ہو رہی ہے، اور میلوں پاٹتی چلی جا رہی ہے، اس لئے کسی وقت عدم توازن کی بنا پر ہوسکتا ہے ،کہ سمندر کے نیچے اتھاہ گہرائیوں میں جمع ہونے والے مادے کا دباؤ پڑنے سے نئے پہاڑ ابھر آئیں یا نئے جزائری سلسلے پیدا ہو جائیں، ساحل کے بعد پہاڑوں میں اس طرح کی سمندری گاد کے نشانات پائے گئے ہیں، مگر انسان کی موجودہ معلومات کے دائرے میں کوئی بھی نظریہ سمندری خندقوں کی مکمل توجیہہ نہیں

---

(۱) O.R.Van Engeln Geomorphology, New York 1948 p.26-27

کرتا، یہ دائمی سرد اور دائمی تاریک غار جو فی مربع انچ سات ٹن بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، وہ ابھی انسان کے لئے سمندر کے دوسرے معموں میں سے ایک معما ہیں۔"

The World We Live In, New York 1965

2۔ اسی طرح قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ زمین پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھاڑ کر پھیلا دیا۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾ (النازعات)

اس کے بعد خدا نے زمین کو پھیلایا اور اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

یہ الفاظ جدید ترین نظریۂ انتشار براعظم (Theory of Drifting Continents) کے عین مطابق ہیں، اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تمام براعظم کسی زمانے میں ایک بڑی زمین کے حصّے تھے، اس کے بعد وہ پھٹ کر سطح زمین پر اِدھر اُدھر پھیل گئے اور بھرے ہوئے سمندروں کے اردگرد براعظموں کی ایک دنیا آباد ہوگئی۔

اس نظریے کو پہلی بار باقاعدہ طور پر 1915ء میں ایک جرمن ماہر ارضیات الفرڈ ویجنر (Alfred Wegener) نے پیش کیا، اس کی دلیل یہ تھی کہ براعظموں کو اگر قریب کیا جائے تو وہ سب کے سب (Jigsaw Puzzle) کی طرح آپس میں جڑ جاتے ہیں (مثلاً جنوبی امریکہ کا مشرقی ساحل افریقہ کے مغربی ساحل سے مل رہا ہے)
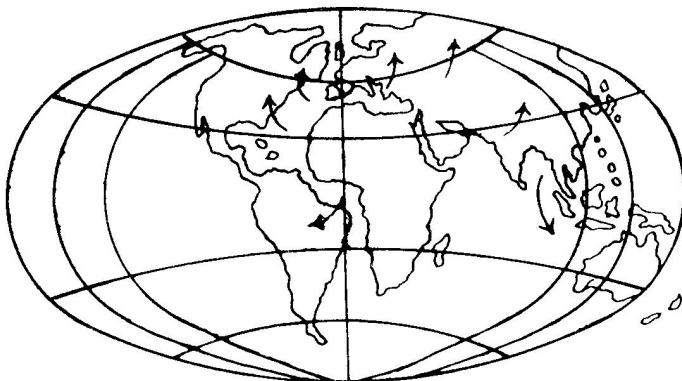
اس قسم کی اور بہت سے مشابہتیں ہیں جو وسیع سمندروں کے دونوں طرف پائی گئی ہیں، مثلاً ایک قسم کے پہاڑ یکساں ارضیاتی سال کی چٹانیں، ایک قسم کے جانور اور مچھلیاں اور ایک طرح کے پودے، چنانچہ علم نباتات کا ماہر پروفیسر رونالڈ گڈ Ronald good اپنی کتاب موسومہ Geography of the Flowering Plants میں لکھتا ہے:۔

''نباتات کے ماہرین کا تقریباً متفقہ نظریہ ہے کہ مختلف پودے جو زمین کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، ان کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ ہم یہ فرض کریں کہ زمین کے ٹکڑے ماضی میں کبھی باہم ملے ہوئے تھے۔''

اور اب تو حجری کشش (Fossil Magnetism) سے تصدیق حاصل ہونے کے بعد اس کو قطعی سائنسی نظریہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، پتھر کے ذرات کے رخ کا مطالعہ کرکے یہ معلوم کرلیا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس کی چٹان کا عرض البلد اور طول البلد کیا تھا، اس مطالعہ سے معلوم ہوا کہ زمین کے موجودہ ٹکڑے ماضی میں ان مقامات پر نہیں تھے، جہاں وہ آج نظر آتے ہیں، بلکہ ٹھیک ان مقامات پر تھے، جہاں براعظموں کے انتشار کا نظریہ تقاضا کرتا ہے، امپیریل کالج (لندن) میں فزکس کے استاد پورفیسر پی۔ ایم۔ ایس۔ بلیکٹ (Blackt) نے کہا ہے:۔

''ہندستانی پتھر کی پیمائش یقینی طور پر بتاتی ہے کہ ستر (۷۰) ملین سال پہلے ہندستان خط استوا کے جنوب میں واقع تھا، جنوبی افریقہ کی چٹانوں کا مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ افریقی براعظم تین سو ملین سال پہلے قطب جنوبی سے ٹوٹ کر نکلا ہے۔''

(تفصیل کے لئے۔ ریڈرز ڈائجسٹ، جون 1961ء)

اوپر ہم نے جو آیت نقل کی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے ''دحو'' کا لفظ استعمال کیا ہے، دحو کے معنی کسی مجتمع چیز کو پھیلانے اور بکھیرنے کے ہیں، عربی میں کہا جاتا ہے: **دحا المطر الحصی عن وجه الارض** ''(بارش زمین پر سے کنکریوں کو بہالے گئی) تقریباً یہی مفہوم

انگریزی لفظ (Drift) کا بھی ہے، جو اس جغرافی نظریے کی تعبیر کے لئے موجودہ زمانے میں اختیار کیا گیا ہے، قدیم ترین ماضی اور حال میں اس حیرت انگیز یکسانیت کی توجیہہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ایسی ہستی کا کلام ہے، جس کا علم ماضی اور حال سب پر محیط ہے۔

غذائیات

کتاب الٰہی میں انسان کے لئے جو مینو بتایا گیا ہے، اس کے مطابق خون ہمارے لئے حرام ہے، نزول کتاب کے وقت تک انسان اس قانون کی غذائی اہمیت سے بے خبر تھا، لیکن بعد کو جب سائنسی طور پر خون کے اجزا کی تحلیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ قانون نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا، سائنسی تجزیہ نے اس کو رد نہیں کیا بلکہ اس کی معنویت ہم پر واضح کی۔

یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ خون میں کثرت سے یورک ایسڈ (Uric Acid) موجود ہے، جو ایک تیزابی مادہ ہونے کی وجہ سے خطرناک زہریلی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے، اور غذا کے طور پر اس کا استعمال سخت مضر ہے، ذبیحہ کا مخصوص طریقہ جو اسلام میں بتایا گیا ہے، اس کی مصلحت بھی یہی ہے، اسلامی اصطلاح میں ذبیحہ سے مراد جانور کو خدا کے نام پر ایسے طریقہ سے ذبح کرنا ہے، جس سے اس کے جسم کا سارا خون نکل جائے، اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ جانور کی صرف شہ رگ کو کاٹا جائے لیکن گردن کی رگوں کو قائم رکھا جائے تاکہ مذبوحہ کے دل اور دماغ کے درمیان موت تک تعلق قائم رہے، اور جانور کی موت کا باعث صرف کامل اخراج خون ہو نہ کہ کسی اعضائے رئیسہ پر صدمہ کا پہنچنا، کیونکہ کسی اعضائے رئیسہ مثلاً دماغ، دل یا جگر کے صدمہ رسیدہ ہونے سے فی الفور موت تو وارد ہو جاتی ہے، لیکن ایسی صورت میں خون آناً فاناً جسم میں منجمد ہو کر تمام گوشت میں سرایت کر جاتا ہے، اور سارا گوشت یورک ایسڈ کی آمیزش کی وجہ سے زہریلا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سور کو بھی حرام کیا گیا ہے، زمانۂ قدیم میں انسان کو اس کے بارے میں کچھ

زیادہ معلوم نہ تھا، مگر جدید طبی تحقیقات نے بتایا ہے کہ اس کے اندر بہت سے نقصانات ہیں، مثلاً مذکورہ بالا یورک ایسڈ جو ایک زہریلا مادہ ہے اور ہر جاندار کے خون میں موجود رہتا ہے، وہ اور جانداروں کے جسم سے تو خارج ہو جاتا ہے، مگر سور کے اندر خارج نہیں ہوتا، گردے جو ہر انسانی جسم میں ہوتے ہیں، وہ اس زہریلے مادے کو پیشاب کے ذریعہ خارج کرتے رہتے ہیں، انسانی جسم اس مادے کو نوے فیصدی خارج کر دیتے ہیں، مگر سور کے جسم کے عضلات کی ساخت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے خون کا یورک ایسڈ صرف دو فیصدی ہی خارج ہو پاتا ہے، اور بقیہ حصہ اس کے جسم کا جزو بنتا رہتا ہے، چنانچہ سور خود بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتا ہے، اور اس کا گوشت کھانے والے بھی وجع المفاصل جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (۱)

اس طرح کی مثالیں کثرت سے قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور یہ مثالیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا ہے، بعد کی معلومات نے حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق کی ہے، جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

> ''عنقریب ہم آفاق وانفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گیں یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔'' (القرآن)

---

(۱) یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ کوئی غذا، خواہ وہ مفید ہو یا مضر، جب اس کی تاثیر بتائی جاتی ہیں تو یہ صرف اس کی انفرادی تاثیر کا بیان ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب وہ کھائی جائے تو لازمی طور پر فوراً ہر شخص میں وہی اثر بھی ظاہر کرے جو انفرادی مطالعہ میں ہم نے اس کے اندر پایا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عموماً کسی چیز کو تنہا شکل میں اس طرح نہیں کھاتا کہ صرف اسی کو اکیلے عمل کرنے کا موقع ملے بلکہ مختلف چیزوں کے ساتھ ایک چیز کو پیٹ میں داخل کرتا ہے، اسی طرح اور بھی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کے عمل سے اکثر ایک چیز کی انفرادی تاثیر گھٹ جاتی ہے، اور بعض اوقات ختم بھی ہو جاتی ہے، تاہم جب کسی چیز کی ذاتی خصوصیات کا تجزیہ کیا جائے تو وہی بات کہی جائے گی جو انفرادی طور پر اس کے اندر ثابت ہو رہی ہو۔

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جس کے راوی علامہ عنایت اللہ مشرقی ہیں، اور اس کا تعلق انگلستان سے ہے:

''1909ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا، اور زور کی بارش ہو رہی تھی، میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (James Jeans) پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے، میں نے قریب ہو کر سلام کیا، انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ''تم کیا چاہتے ہو'' میں نے کہا، دو باتیں اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے، سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا، دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق آدمی گرجا گھر میں عبادت کے لئے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا'' آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو'' چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا ٹھیک 4 بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں ''سر جیمز تمہارے منتظر ہیں'' اندر گیا تو ایک چھوٹی سے میز پر چائے لگی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے، کہنے لگے ''تمہارا سوال کیا تھا'' اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پنہائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا، اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت وخشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے، اور آواز لرز رہی تھی، فرمانے لگے ''عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی کا ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے، مجھے بیحد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے، مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے، کہو عنایت اللہ خاں! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں۔''

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کردیا میں نے کہا ''جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں، اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آ گئی اگر اجازت ہو تو پیش کروں، فرمایا ''ضرور'' چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ (فاطر 26۔28)

پہاڑوں میں خطے ہیں، سفید اور سرخ اور طرح طرح کے رنگ کے اور کالے اور آدمیوں میں اور کیڑوں میں اور چوپاؤں میں، اسی طرح مختلف رنگ ہیں، اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں سے جو علم رکھتے ہیں۔

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:۔

''کیا کہا ـــــــ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ ومشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمدؐ کو کس نے بتائی، کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے، اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے، محمدؐ ان پڑھ تھا، اسے یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہوسکتی، اسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی، بہت خوب، بہت عجیب ـــــــ

(نقوش شخصیات نمبر، صفحات 9۔1208)

مذہب اور تمدّنی مسائل

تمدنی مسائل کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کا قانون کیا ہو، تمدنی مسائل انسانوں کے باہمی روابط سے پیدا ہوتے ہیں، اوران روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے، وہ قانون ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کرسکا، کہنے کو اگرچہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں، مگر یہ تمام ''قوانین'' نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ، رائج الوقت قوانین اپنے حق میں علمی اورنظریاتی بنیاد سے محروم ہیں۔۔۔فلر (L.L.Fuller) کے الفاظ میں قانون نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا ہے، اس نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے۔ ''قانون خود اپنی تلاش میں۔''

The Law in Quest of Itself

دورِجدید میں ان مسائل پر بے شمار لٹریچر تیار ہوا ہے، بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اوراپنے بہترین اوقات اس کے لئے صرف کررہے ہیں، اور چیمبرز انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں ''قانون کو ایک زبردست فن کی حیثیت دے کر اس کو عظیم ترقی تک پہونچا دیا ہے۔'' مگر اب تک کی ساری کوششیں قانون کا کوئی متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں، حتیٰ کہ ایک عالم قانون کے الفاظ میں ''اگر دس قانون دانوں کو قانون کی تعریف بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو بلا مبالغہ ہم کو گیارہ مختلف قسم کے جوابات سننے کے

لئے تیار رہنا چاہئے'' ماہرین قانون کی مختلف اقسام کو الگ کرنے کے لئے انھیں مختلف مکاتیب فکر میں تقسیم کیا جاتا ہے، مگر ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ بہت سے مصنفین اس طرح کی اختیار کردہ وسیع ترین تقسیم کی حد بندیوں میں بھی نہیں آتے، مثال کے طور پر جان آسٹن John Austin کے متعلق پروفیسر پیٹن G.W.Paton نے لکھا ہے کہ وہ ہماری وسیع قسم بندی (Broad Division) میں سے کسی ایک میں بھی پوری طرح موزوں نہیں بیٹھتا۔''

A Textbook of jurisprudence,1905, p.5

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کی تشکیل کر سکیں، وہ قانون کے اندر جن ضروری قدموں کو یکجا کرنا چاہتے ہیں، جب وہ انھیں یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکجا ہو رہی ہیں، اس سلسلے میں ماہر قانون کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو مینڈکوں کی پنسیری بنا رہا ہو، ظاہر ہے کہ وہ پانچ مینڈکوں کو یکجا کرے گا تو دوسرے پانچ اس کے پلڑے میں سے پھدک کر نکل چکے ہوں گے، اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی اب تک کوششیں صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں، فرائڈمین W.Friedmann کے الفاظ میں:۔

''یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔''

Legal Theory, p.18

جان آسٹن جس کی کتاب پہلی بار 1861ء میں شائع ہوئی، اس نے دیکھا کہ قوت نافذہ کے بغیر کوئی قانون، قانون نہیں بنتا، اس لئے اس نے قانون کی تعریف یہ کی:۔

''قانون ایک حکم ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص (Political Superior) نے سیاسی طور پر ادنیٰ شخص (Political Inferior) کے لئے نافذ کیا ہو۔''

A Textbook of jurisprudence, p.56

اس تعریف میں قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان Command of the Sovereign بن کر رہ گیا۔(پیٹن ص 6)

چنانچہ بعد کو اس پر شدید اعتراضات کئے گئے، نیز حکمرانوں کی بدعنوانی دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور ابھرا کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہئے، چنانچہ ایسے علماء قانون پیدا ہوئے جنھوں نے کسی ایسے ضابطہ وقاعدہ کو قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا جس کی پشت پر قوم کی رضامندی نہ ہو،اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ضابطہ تمام اہل علم اور معلمین اخلاق کے نزدیک صحیح اور مفید ہونے کے باوجود محض اس لئے رائج نہیں ہوسکتا کہ رائے عامہ اس کے خلاف ہے،مثلاً امریکہ میں شراب کی پابندی کے قانون کو امریکی قوم کی رضامندی نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی،اسی طرح برطانیہ میں قتل کی سزا میں ترمیم کرنی پڑی اور ہم جنس جیسی قبیح حرکت کو قانون کی حد میں لانا پڑا،حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے خلاف تھے،اسی طرح یہ بات بھی زبردست بحث کا موضوع رہی ہے،کہ قانون قابل تغیّر ہے یا ناقابل تغیّر _____ قرون وسطیٰ اور زمانۂ ماقبل تجدید Post renaissance Period میں قانونِ طبعی یا قانونِ فطرت کو کافی فروغ حاصل ہوا،اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی جو فطرت ہے،وہی قانون کا بہترین ماخذ ہے:۔

> ''فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے پر حکومت کا حق خود اسی کے فطرے تقاضوں اور رہنما اصولوں کو پہونچتا ہے،اور انسان کے لئے قدرت نے یہ رہنما اصول اس کی عقل کی شکل میں پیدا کئے ہیں لہٰذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔''

Jurisprudence By bodenheimer, p. 164

اس تصور نے قانون کو ایک آفاقی بنیاد فراہم کردی،یعنی وہ ایک ایسی چیز سمجھا جانے لگا جس کو ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہئے،یہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کا تصور قانون تھا،اس

کے بعد دوسرا مکتب فکر پیدا ہوا اور اس نے دعویٰ کیا کہ قانون کے آفاقی قواعد معلوم کرنا بالکل ناممکن ہیں، کوہلر Kohler لکھتا ہے۔

> ''یہاں کوئی ابدی قانون (Eternal Law) نہیں ہے، ایک قانون جو ایک عہد کے لئے موزوں ہو، وہی لازمی طور پر دوسرے عہد کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا، ہم صرف اس بات کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ہر کلچر کے لئے اس کے مناسب حال نظام قانون کو فراہم کریں، کوئی چیز جو ایک کے لئے خیر ہو، وہی دوسرے کے لئے مہلک ہوسکتی ہے۔''

Philosophy of Law, p.5

اس تصور نے فلسفۂ قانون کا سارا استحکام ختم کر دیا، یہ تصور انسانی فکر کو اندھا دھند تغیر پذیری Relativism کی طرف لے جاتا ہے، اور چونکہ یہ کسی بنیاد سے محروم ہے، اس لئے اس کی کوئی منزل نہیں، یہ تصور زندگی کی تمام اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیتا ہے، پھر ایک گروہ نے ہر طرف سے سمٹ کر عدل کے پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی۔۔۔۔۔۔لارڈ رائٹ (Lord Wright) ڈین راسکو پاونڈ (Dean Roscoe Pound) کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> ''راسکو پاونڈ ایک ایسی بات کہتا ہے جس کی صداقت پر میں اپنے تمام تجربات اور قانونی مطالعہ کے نتیجے میں بالکل مطمئن ہو چکا ہوں، وہ یہ قانون کا ابتدائی اور بنیادی مقصد انصاف کی تلاش (Quest of Justice) ہے۔''

Interpretation of Modren Legal philosophies, New york 1947, p.794

مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف کیا ہے، اور اس کو کیسے متعین کیا جا سکتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہونچ جاتی ہے، جہاں آسٹن کو ہم نے چھوڑا تھا، اس طرح سیکڑوں برس کی تلاش و تحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لئے کوئی واقعی بنیاد فراہم نہ کر سکا، یہ احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ جدید فلسفہ، مقاصد قانون

کے اہم مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے، پروفیسر پیٹن (George Whitecross Paton) لکھتے ہیں:۔

''کیا مفادات (Interests) ہیں جن کا تحفظ ایک معیاری قانونی نظام کو کرنا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جو اقدار (values) سے متعلق ہے، اور وہ فلسفۂ قانون کے دائرہ بحث میں آتا ہے، مگر اس معاملے میں ہم فلسفہ سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا ہی اس کا حصول مشکل ہوتا ہے، کوئی بھی قابل قبول پیمانہ اقدار (Scale of Values) اب تک دریافت نہیں ہوسکا ہے، درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اس کی ایک بنیاد پاسکتے ہیں، مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا وجدان کے تحت قبول کی جاتی ہیں، نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر۔''

A Textbook of jurisprudence, p.104

آگے وہ کچھ علمائے قانون کا یہ خیال نقل کرتا ہے کہ وہ مدتوں فلسفۂ قانون کی بھول بھلیاں میں گردش کرنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ فلسفۂ قانون کے مقصد کے فلسفیانہ مطالعہ کی جو کوشش کی ہے، وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتی (صفحہ 106) پھر وہ سوال کرتا ہے____ ''کیا کچھ معیاری اقدار Ideal values ہیں، جو ارتقائے قانون میں اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔'' (صفحہ 108) ایسی اقدار اگرچہ اب تک دریافت نہیں ہوسکیں لیکن وہ قانون کے لئے ناگزیر ہیں، مگر دقت یہ ہے، کہ مذہب کو الگ کرنے کے بعد اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

The Orthodox Natural Law Theory based its absolutes on the revealed truths of religion.If we attempt to secularise jurisprudence,where can we find an agreed basis of values. P.109

یہ طویل تجربہ انسان کو دوبارہ اسی طرف لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے، جہاں سے اس نے انحراف کیا تھا، قدیم زمانے میں قانون کی تدوین وتشکیل میں مذہب کا بہت بڑا حصہ

ہوتا تھا، چنانچہ تاریخ قانون کا ماہر سر ہنری مین (Sir Henry Maine) لکھتا ہے:۔

''تحریری طور پر منضبط قانون کا کوئی ایسا نظام، چین سے پیرو (Peru) تک ہمیں نہیں ملتا جو اپنے دور آغاز ہی سے مذہبی رسوم وعبادات کے ساتھ ہم رشتہ نہ رہا ہو۔''

Early Law and Custom, p.5

اب وقت آ گیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کر سکتا، لا حاصل کوشش کو مزید جاری رکھنے کے بجائے اب ہمارے لئے بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر فرائڈ مین کے الفاظ میں ہم اعتراف کر لیں کہ۔

''ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، کہ انصاف کے حقیقی معیار کو معین کرنے کے لئے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی، اور انصاف کے مثالی تصور کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے مذہب کی دی ہوئی اساس بالکل منفرد طور پر حقیقی اور سادہ بنیاد ہے۔''

Legal Theory, p.450

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں، جو ایک معیاری قانون کے لئے ماہرین تلاش کر رہے ہیں، مگر وہ اب تک اسے نہ پا سکے۔

ا۔ قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ قانون کون دے، وہ کون ہو جس کی منظوری (Sanction) سے کسی قانون کو قانون کا درجہ عطا کیا جائے، ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے، اگر حاکم کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو نظری طور پر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور نہ عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جو چاہے، قانون بنائے اور جس طرح چاہے نافذ کرے، اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو ''قانون ساز'' قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے، کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم ہی نہیں رکھتا جو

قانون سازی کے لئے ضروری ہے، قانون بنانے کے لئے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے، اور نہ ان کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں درک حاصل کرسکیں، اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جاسکے جو سارے معاشرہ کی اپنی رائے ہو۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی کے عاقل اور بالغ افراد اپنے نمایندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمایندے کی حیثیت سے اجتماع کے لئے قانون بنائیں، مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ 51 فیصدی کو صرف دو عدد کی اکثریت کی بنا پر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ 49 فیصدی کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں، مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً ۵۱ فیصدی کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے، مثال کے طور پر ہندستان میں اس وقت ہم جس حکومت کے تحت ہیں، وہ 1964ء میں تیسرے عام الیکشن کے ذریعہ برسر اقتدار آئی ہے، کانگریس کو ملک میں یہ اقتدار 70 فیصدی نشستوں پر قبضہ کر کے حاصل ہوا ہے، جبکہ اس کو ووٹ صرف چالیس فیصدی ملے تھے، یہی حال آزادی کے بعد پچھلے دونوں الکشنوں کا بھی تھا، ہر بار کانگریس کو پچاس فیصدی سے کم ووٹ ملے، مگر اس کے باوجود ہر بار اسی نے حکومت بنائی اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ ووٹ پچاس فیصدی سے زائد ہونے کے باوجود مختلف پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور کسی ایک پارٹی کے مقابلے میں کانگریس کے رائے دہندگان کی تعداد زیادہ تھی، صرف اشتراکی ملکوں کے مصنوعی انتخابات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اس طرح فلسفۂ قانون کو آج تک اس مسئلہ کا کوئی واقعی حل معلوم نہ ہوسکا، مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ خدا ہے، جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبیعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے، اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے، اس

کے سوا کوئی بھی نہیں ہے، جس کو یہ حیثیت دی جا سکے، یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور جواب نہیں ہو سکتا، یہ جواب اس سوال پر اسی طرح بالکل راست آ رہا ہے، جیسے کوئی ڈھکّن غلط شیشوں پر بیٹھ نہ رہا ہو، اور جیسے ہی اس کے اصل مقام پر اسے لایا جائے وہ ٹھیک ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پہونچ گیا جہاں نہ پہونچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں لے جائیں، انسانوں کے اوپر انسان کو حاکم اور قانون ساز نہیں بنایا جا سکتا، اس کا حق صرف اسی کو ہے جو دوسرے انسانوں کا خالق اور بالفعل ان کا طبیعی حاکم ہے۔

2۔ قانون کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سارا حصہ اضافی ہے یا اس کا کوئی جزو حقیقی نوعیت بھی رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر قانون جو آج رائج ہے کل بدلا جا سکتا ہے یا اس کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو ناقابل تغیر ہے، اس سلسلے میں طویل ترین بحثوں کے باوجود آج تک کوئی قطعی بنیاد حاصل نہ ہو سکی، علمائے قانون اصولی طور پر اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون میں ایک ایسا عنصر ضروری ہے جو دوامی نوعیت رکھتا ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں ایسے اجزاء بھی ہونے چاہئیں جن میں لچک ہو تاکہ بدلتے ہوئے حالات پر انھیں بآسانی منطبق کیا جا سکے _____ دونوں میں سے کسی ایک پہلو کی کمی بھی قانون کے لئے سخت مضر ہے، امریکہ کے ایک جج مسٹر کارڈوزو (Justice Cardozo) لکھتے ہیں:۔

> ''آج قانون کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفۂ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متحارب تقاضوں کے درمیان توافق پیدا کرے۔''

(The Growth of the Law)

ایک اور عالم قانون لکھتا ہے:۔

’’قانون کوضرور مستحکم ہونا چاہئے، لیکن اس کے باوجود اس میں جمود نہیں پیدا ہونا چاہئے، اسی وجہ سے قانون کے متعلق مفکرین نے اس بارے میں کافی جدوجہد کی ہے، کہ کس طرح استحکام اور تبدیلی کے دوطرفہ تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔‘‘

Roscoe pound,Interpretation of Lrgal History, p.1

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی قوانین میں اس قسم کا فرق پیدا کرنا ناممکن ہے، کیونکہ قانون کے کسی حصہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دائمی اور نا قابل تغیر ہے، کوئی دلیل چاہتا ہے، اور انسانی قانون ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے، آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل سے دائمی قرار دیں گے، اور کل کچھ لوگوں کی عقل کو نظر آئے گا کہ وہ دائمی ہونے کے قابل نہیں ہے، اور وہ دوبارہ اس کے قابلِ تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے، خدا کا قانون ہم کو وہ تمام بنیادی اصول دے دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا لازمی جزو ہونے چاہئیں، یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے، اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے، اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہے کہ قانون کا کون سا حصہ دائمی ہے، اور کون سا حصہ قابلِ تغیر ہے، پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی برحق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

3۔ اسی طرح قانون کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی معقول وجہ موجود ہو کہ وہ کیوں کسی چیز کو ’’جرم‘‘ قرار دیتا ہے۔ انسانی قانون کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جو عمل ’’امن عامہ یا نظم مملکت‘‘ میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے، اس کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی فعل کو جرم کیسے قرار دے، یہی وجہ ہے کہ قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا اصلاً جرم نظر نہیں آتا بلکہ وہ صرف اس وقت جرم بنتا ہے، جبکہ طرفین میں سے کسی نے دوسرے پر جبر کیا ہو، گویا انسانی قانون کے نزدیک اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر و اکراہ ہے۔ جس طرح زبردستی کسی

کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے، اسی طرح زبردستی اس کی آبرو پر دست درازی بھی جرم ہے، لیکن باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کا مال دوسرے کے لئے جائز ہوجاتا ہے، اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے، اس باہمی رضامندی کی شکل میں قانون، زنا کا حامی ومحافظ بن جاتا ہے، اور اگر تیسرا شخص مداخلت کر کے زبردستی انھیں روکنا چاہے تو الٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا۔

زنا کا ارتکاب سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے، وہ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے، وہ رشتۂ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے، وہ سطحی لذتیت کا ذہن پیدا کرتا ہے، وہ چوری اور خیانت کی تربیت کرتا ہے، وہ قتل اور اغوا کو فروغ دیتا ہے، وہ سارے سماج کے دل ودماغ کو گندا کر دیتا ہے، مگر اس کے باجود قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کے پاس زنا بالرضا کو جرم قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی قانون کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے، کیونکہ اکل وشرب انسان کا ایک فطری حق ہے، اس لئے وہ جو چاہے کھائے، اس میں قانون کو مداخلت کرنے کی کیا ضروت، اس لئے اس کے نزدیک نہ شراب پینا جرم ہے اور نہ اس سے پیدا شدہ بدمستی اصلاً قابل مواخذہ ہے، البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوج کر بیٹھا یا ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی، یا شارع عام پر وہ اس طرح جھومتا ہوا چلا کہ خمار اس کی حرکات سے بالکل نمایاں تھا، تب کہیں جا کر قانون اس پر ہاتھ ڈالنا جائز سمجھے گا، گویا انسانی قانون کی رو سے فی الحقیقت شراب نوشی کا فعل قابل گرفت نہیں ہے، بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہنچانا ہے۔

شراب ونشہ صحت کو تباہ کرتی ہے، وہ مال کے ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جاسکتی ہے، اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے، اور انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے، شراب مجرمین کی ایک بہترین مددگار ہے، جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات

مفلوج ہوجاتے ہیں، اور پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر قانون اسے بند نہیں کرسکتا، کیوں کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل وشرب پر پابندی عائد کرے۔

اس مشکل کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے، کیونکہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے، کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذات خود اس بات کی کافی وجہ ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو اس کے بعد اس کے لئے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں، اس طرح خدائی قانون، قانون کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے کہ کس بنیاد پر کس فعل کو قانون کی زد میں لایا جائے۔

4۔ قانون کبھی خود مکتفی نہیں ہوسکتا، مختلف وجوہ کی بنا پر اس کے ساتھ اخلاق کا ہم رشتہ ہونا ضروری ہے۔

(الف) مثلاً ایک مقدمہ قانون کے سامنے آتا ہے، اس وقت اگر خالص سچائی منظرِ عام پر نہ آئے تو قانون کا عادلانہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوسکتا، اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہوجائے گا، اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی گویا قانون کے ساتھ کسی ایسے ماورائے قانون کا تصور کی بھی لازمی ضرورت ہے، جو لوگوں کے لئے سچ بولنے کا محرک بن سکے، سچائی کے لازمۂ قانون وانصاف ہونے کا اعتراف دنیا بھر کی عدالتیں اس طرح کرتی ہیں کہ وہ ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھائے اور حلف اٹھا کر اپنا بیان دے، قانون کے لئے مذہبی اعتقادات کی اہمیت کی یہ ایک نہایت واضح مثال ہے، مگر جدید سوسائٹی میں مذہب کی حقیقی اہمیت چونکہ ہر پہلو سے ختم کردی گئی ہے، اس لئے عدالتوں کی مذہبی قسمیں اب صرف ایک روایت بلکہ مسخرہ بن کر رہ گئی ہیں، اور ان کا کوئی واقعی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قانون جس فعل کو جرم قرار دے کر اس پر سزا دینا

چاہتا ہے، اس کے بارے میں خود سماج کے اندر بھی یہ احساس موجود ہو کہ یہ فعل جرم ہے، محض کوڈ میں چھپے ہوئے الفاظ کی بنا پر وہ فضا پیدا نہیں ہوسکتی، جو کسی جرم پر سزا کے اطلاق کے لئے درکار ہے، ایک شخص جب جرم کرے تو اس کے اندر مجرمانہ ذہن Guilty Mind کا پایا جانا ضروری ہے، وہ خود اپنے آپ کو مجرم سمجھے اور سارا سماج اس کو مجرم کی نظر سے دیکھے، پولیس پورے اعتماد کے ساتھ اس پر دست اندازی کرے، عدالت میں بیٹھنے والا جج پوری آمادگیٔ قلب کے ساتھ اس پر سزا کا حکم جارے کرے، دوسرے لفظوں میں ایک فعل کے ''جرم'' ہونے کیلئے اس کا ''گناہ'' ہونا ضروری ہے، قانون کے تاریخی مکتبِ فکر کا یہ کہنا کہ۔۔۔قانون سازی جبھی کامیاب ہوسکتی ہے جب کہ وہ اس نسل کے داخلی اعتقادات (Internal Convictions) کے مطابق ہو جس کے لئے قانون وضع کیا گیا ہے، اگر وہ اس سے غیر متعلق ہو تو ایسے قانون کا ناکام ہونا یقینی ہے۔''(۱)

اپنے مخصوص مکتب فکر کے استدلال کے طور پر تو صحیح نہیں ہے مگر اس میں ایک خارجی صداقت بیشک موجود ہے۔

(ج) ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کے عمل درآمد سے پہلے سماج کے اندر ایسے محرکات موجود ہوں جو لوگوں کو جرم کرنے سے روکتے ہوں، صرف پولیس اور عدالت کا خوف اس کے لئے کافی محرک نہیں بن سکتا، کیونکہ پولس اور عدالت کے اندیشہ سے تو رشوت، سفارش، غلط وکالت اور جھوٹی گواہیاں بھی بچا سکتی ہیں، اور اگر ان چیزوں کو استعمال کر کے کوئی شخص اپنے آپ کو جرم کے قانونی انجام سے بچالے جائے تو پھر اسے مزید کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

خدائی قانون میں ان تمام چیزوں کا جواب موجود ہے، خدائی قانون کے ساتھ مذہب وآخرت کا عقیدہ وہ ماورائے قانون فضا پیدا کرتا ہے، جو لوگوں کو سچائی پر ابھارے، وہ اس

---

(۱) A Texbookof jurisprudence, p.15

درجہ موثر ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی مفاد کے تحت جھوٹا حلف اٹھائے تو اپنے دل کو ملامت سے نہیں بچا سکتا، ویسٹرن سرکٹ کی عدالت میں ایک پتھر نصب ہے جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے کہ ایک گواہ نے قسم کے عام کلمات دہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ ''اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کر لے'' چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہوگا، (۱) اس طرح کے واقعات اور بھی پیش آئے ہیں، اسی طرح جرم کے فعل شنیع ہونے کا عام احساس بھی محض اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹوں کے ذریعہ پیدا نہیں ہوسکتا، اس کی بھی واحد بنیاد خدا اور آخرت کا عقیدہ ہے، اسی طرح جرم نہ کرنے کا محرک بھی صرف مذہب ہی پیدا کرسکتا ہے، کیونکہ مذہب صرف قانون نہیں دیتا بلکہ اسی کے ساتھ یہ تصور بھی دلاتا ہے کہ جس نے یہ قانون عائد کیا ہے، وہ تمہاری پوری زندگی کو دیکھ رہا ہے، تمہاری نیت، تمہارا قول، تمہاری تمام حرکتیں اس کے ریکارڈ میں مکمل طور پر منضبط ہو چکی ہیں، مرنے کے بعد تم اس کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہارے لئے ممکن نہ ہوگا کہ تم اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکو، آج سزا سے بچ گئے تو وہاں کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے، بلکہ دنیا میں اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لئے اگر تم نے غلط کوششیں کیں تو آخرت کی عدالت میں تمہارے اوپر دہرا مقدمہ چلے گا، اور وہاں ایک ایسی سزا ملے گی جو دنیا کی سزا کے مقابلے میں کروڑوں گنا سخت ہے۔

5۔ انگلستان کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جیمز اول James 1 نے اعلان کیا کہ وہ مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کرسکتا ہے، اور عدالتوں میں استغاثہ اور مرافعہ کے بغیر معاملات میں آخری فیصلے دے سکتا ہے، یہ مشہور چیف جسٹس لارڈ کوک (Coke) کا زمانہ تھا، وہ ایک مذہبی آدمی تھے، اور اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کرتے تھے، انھوں نے بادشاہ سے کہا ''تمہیں فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، تمام مقدمات عدالت میں

---

(۱) The changing Law, p.103

جانے چاہئیں'' بادشاہ نے کہا'' میرا خیال ہے اور یہی میں نے سنا بھی ہے کہ تمہارے قوانین کی بنیاد عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے کم تر عقل ہے'' چیف جسٹس نے جواب دیا ''تم بلاشبہ بہت علم وصلاحیت کے مالک ہو، لیکن قانون کے لئے بڑے تجربے اور مطالعہ کی ضرورت ہے، یہ تو ایک سنہرا پیمانہ ہے، جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہے، اور خود جناب والا کی حفاظت کی جاتی ہے۔'' بادشاہ نے انتہائی غصہ ہوکر کہا'' کیا میں بھی قانون کا ماتحت ہوں'' ایسا کہنا تو غداری ہے'' لارڈ کوک نے بریکٹن (Bracton) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:۔

''بادشاہ کسی آدمی کا ماتحت نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا ماتحت ہے۔''

The Changing Law by SirAlfred Denning (1953) p. 117. 118

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو قانون سے الگ کردیں تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کوئی معقول بنیاد نہیں رہتی کہ ____ بادشاہ قانون کے ماتحت ہے'' کیونکہ جن افراد نے خود اپنی رایوں سے قانون بنایا ہو، جن کے اذن (Sanction) سے وہ قانونی طور پر جاری ہوا ہو، جو اس کو باقی رکھنے یا بدلنے کا حق رکھتے ہوں آخر کس بنا پر وہ اس کے ماتحت ہوجائیں گے، جب انسان ہی قانون ساز ہو تو بالکل فطری طور پر وہ خدا اور قانون دونوں کا جامع ہو جاتا ہے، وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہوتا ہے، ایسی حالت میں قانون سازوں کو قانون کے دائرے میں لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ تمام جمہوریتوں میں شہری مساوات کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود قانونی طور پر سب یکساں نہیں ہیں، اگر آپ ہندستان کے صدر، گورنر، وزیر یا کسی افسر اعلیٰ پر مقدمہ چلانا چاہیں تو آپ اسی طرح اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلا سکتے جیسے ایک عام شہری کے خلاف آپ کرلیتے ہیں، بلکہ ایسے کسی مقدمے کو عدالت میں لے جانے سے پہلے حکومت سے اس کی اجازت لینی ہوگی، دستور ہند کی دفعہ 361 کے تحت صدر جمہوریہ اور ریاستوں

کے گورنر کیلئے یہ تحفظ دیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر کسی عدالت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے خلاف کسی دعوے کی سماعت کر سکے، اسی طرح وزراء کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لئے حکومت سے پیشگی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے، بلکہ تعزیرات ہند کی دفعہ 197 کی رو سے ''کوئی جج، مجسٹریٹ یا کوئی سرکاری ملازم، جو مرکزی یا صوبائی حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے عہدہ سے معزول نہ کیا جا سکتا ہو، اگر اس کے خلاف کسی بدعنوانی کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تو اس کی سماعت کا حق کسی عدالت کو اس وقت تک نہیں ہے، جب تک مرکزی یا ریاستی حکومت سے اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے، جس سے کہ اس شخص کی ملازمت متعلق ہے'' دوسرے لفظوں میں اگر آپ کسی اعلیٰ سیاسی یا انتظامی شخصیت پر مقدمہ چلانا چاہیں تو خود اسی سے پوچھنا ہوگا کہ آپ کے اوپر مقدمہ چلایا جائے یا نہیں۔

یہ ہندستان کے قانونی نظام کا نقص نہیں ہے بلکہ انسانی قانون کا نقص ہے، اور یہ نقص ہر اس جگہ پایا جاتا ہے، جہاں انسانی قانون سازی کا اصول رائج ہے، صرف خدائی قانون میں یہ ممکن ہے کہ ہر شخص کی حیثیت سے قانون کی نظر میں یکساں ہو، اور ایک حاکم پر اسی طرح عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکے جس طرح محکوم پر چلایا جاتا ہے، کیونکہ ایسے نظام میں قانون ساز خدا ہوتا ہے، بقیہ تمام لوگ یکساں طور پر زیرِ قانون۔

6۔ قانون کی آخری اور سب سے بڑی خصوصیت جس کو ہمارے ماہرین صدیوں سے تلاش کر رہے ہیں، اور اب تک وہ اسے حاصل نہ کر سکے وہ بھی صرف مذہبی قانون میں موجود ہے _____ یعنی قانون کی منصفانہ بنیاد، یہ سمجھا جاتا ہے کہ منصفانہ قانون کی بنیاد کا حاصل نہ ہونا تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت ہے، نہ کہ اس بات کا ثبوت کہ انسان اسے حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ طبعی قوانین کی دریافت میں انسان نے بے حساب ترقی کی ہے، اور اس کے مقابلے میں تمدنی قوانین کی دریافت میں اس درجہ کی بلکہ اس سے زیادہ کوششوں کے باوجود ایک فی صدی بھی کامیابی نہیں ہوئی، تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ

یہ محض تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو چیز تلاش کی جارہی ہے اس کا پانا انسان کے بس ہی میں نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلا فوٹو ایک فرانسیسی سائنسداں نے 1826ء میں کھینچا، اس میں آٹھ گھنٹے کا وقت لگا اور اس نے اپنے کمرے کے برآمدے کا فوٹو کھینچا تھا، لیکن تصویر کشی کی موجودہ رفتار کا حال یہ ہے کہ فلم کا متحرک کیمرا ایک سکنڈ میں دو ہزار سے بھی زیادہ تصویریں کھینچ لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے جتنی دیر میں صرف ایک تصویر کھینچی جاسکتی تھی، اتنی دیر میں آج چھ کرور تصویریں لی جاسکتی ہیں، گویا رفتار کے معاملے میں 140 سال میں انسان نے چھ کرور گنا ترقی کی ہے، امریکہ میں بیسویں صدی کے آغاز میں سارے ملک میں صرف چار موٹر کاریں تھیں، اب تقریباً دس کروڑ کاریں وہاں سڑکوں پر دوڑتی ہیں، انسان کی باریک بینی کا یہ حال ہے کہ آج وہ 10,00,000 /1 سکنڈ کو بھی ہزارویں حصے تک تقسیم کرسکتا ہے یعنی ایک سکنڈ کے دس لاکھوں حصے کا ہزارواں حصہ، چنانچہ زمین کی گردش میں فرق پڑنے سے اگر ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصے کے بقدر چھوٹا یا بڑا رصدگاہوں میں اسے معلوم کرلیا جاتا ہے، آج ایسے حساس آلے دریافت ہوچکے ہیں کہ اگر تیس جلدوں کی انسائیکلوپیڈیا میں کسی ایک صفحہ پر دو الفاظ بڑھائے جائیں تو اس کی سیاہی سے وزن میں جو فرق پڑے گا، اس کو وہ فوراً بتادیں گے ــــــ یہ طبیعی قوانین کی دریافت میں انسان کی ترقی کا حال ہے ،مگر جہاں تک تمدنی قوانین کا معاملہ ہے، وہ اس میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

یہاں میں چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ دعویٰ کس قدر صحیح ہے کہ صرف خدائی مذہب ہی وہ حقیقی بنیاد ہے، جس سے ہم انسانی زندگی کا قانون اخذ کرسکتے ہیں۔

معاشرت

اسلام کی نظر میں عورت مرد برابر نہیں ہیں، چنانچہ اس نے دونوں صنفوں کے درمیان

آزادانہ اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے، اوراس کو بند کرنے کا حکم دیا ہے، اس کے بعد جب صنعتی دور شروع ہوا تو اس اصول کا بہت مذاق اڑایا گیا، اوراسکو دور جہالت کی یادگار قرار دیا گیا، بڑے زور شور سے یہ بات کہی گئی کہ عورت مرد دونوں یکساں ہیں، اور دونوں مساوی طور پر نسل انسانی کے وارث ہیں، ان کے میل جول کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنا ایک جرم عظیم ہوگا، چنانچہ ساری دنیا میں اور خاص طور سے مغرب میں اس اصول پر ایک نئی سوسائٹی ابھرنا شروع ہوئی، مگر طویل تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ پیدائشی طور پر دونوں یکساں نہیں ہیں، اس لئے دونوں کو یکساں فرض کر کے جو سماج بنایا جائے وہ لازمی طور پر بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

پہلی بات یہ کہ عورت اور مرد میں فطری صلاحیتوں کے زبردست نوعی اختلافات ہیں اس لئے دونوں کو مساوی حیثیت دینا اپنے اندر ایک حیاتیاتی تضاد رکھتا ہے، ڈاکٹر الکسس کیرل، عورت اور مرد کے فعلیاتی (Physiological) فرق کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''مرد اور عورت کا فرق محض جنسی اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقۂ تعلیم ہی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ اختلاف بنیادی قسم کے ہیں، خود نسیجو کی بناوٹ اور پورے نظامِ جسمانی کے اندر خاص کیمیائی مادے وخصیۃ الرحم سے مترشح ہوتے رہتے ہیں، ان اختلافات کا حقیقی باعث ہیں، صنف نازک کے ترقی کے حامی ان بنیادی حقیقتوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم، ایک ہی قسم کے اختیارات اور ایک ہی قسم کی ذمہ داریاں ملنی چاہئیں، حقیقت یہ ہے کہ عورت، مرد سے بالکل ہی مختلف ہے، اس کے جسم کے ہر ایک خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے، اس کے اعضا اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کی بھی یہی حالت ہوتی ہے، فعلیاتی قوانین (Physiological Law) اتنے ہی اٹل ہیں، جتنے کہ فلکیات (Sidereal World) کے قوانین اٹل ہیں، انسانی آرزوؤں سے ان کو بدلا نہیں جاسکتا، ہم ان کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہیں، جس طرح وہ پائے جاتے

ہیں،عورتوں کو چاہئے کہ اپنی فطرت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کی ترقی دیں اور مردوں کی نقالی کرنے کی کوشش نہ کریں۔‘‘

Man the Unknown, p.93

عملی تجربہ بھی اس فرق کی تصدیق کررہا ہے، چنانچہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا،حتیٰ کہ وہ شعبے جو خاص طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، وہاں بھی مرد کو عورت کے اوپر فوقیت حاصل ہے، میری مراد فلمی ادارے سے ہے، نہ صرف یہ کہ فلمی اداروں کی تنظیم تمام تر مردوں کے ہاتھ میں ہے بلکہ اداکاری کے اعتبار سے بھی مرد کی اہمیت عورت سے زیادہ ہے، چانچہ آج ایک مشہور ترین فلم ایکٹر ایک فلم کے لئے چھ لاکھ روپے لیتا ہے، جبکہ مشہور ترین فلم ایکٹرس کو چار لاکھ ملتے ہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے،اگر ہم طبیعی اور فلکیاتی قوانین کو تسلیم نہ کریں اور ان کے خلاف چلنا شروع کردیں تو یہ صرف ایک واقعہ کا انکار ہی نہیں ہوگا بلکہ ہمارا سر بھی ٹوٹ جائے گا،اسی طرح عورت اور مرد کی جداگانہ حیثیات کو نظر انداز کر کے انسان نے جو نظام بنایا،اس نے تمدن کے اندر زبردست خرابیاں پیدا کردیں،مثال کے طور پر اس غلط فلسفے کی وجہ سے دونوں صنفوں کے درمیان جو آزادانہ اختلاط پیدا ہوا ہے، اس نے جدید سوسائٹی میں نہ صرف عصمت کا وجود باقی نہیں رکھا، بلکہ ساری نوجوان نسل کو طرح طرح کی اخلاقی اورنفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کردیا ہے، آج مغربی زندگی میں یہ بات عام ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی ڈاکٹر کے کمرہ میں داخل ہوتی ہے، اس کو سر درد اور بے خوابی کی شکایت ہے، وہ کچھ دیر اپنی ان تکلیفات پر گفتگو کرتی ہے،اس کے بعد ایک مرد کا ذکر شروع کردیتی ہے ،جس سے ابھی وہ جلد ہی ملی تھی،اتنے میں ڈاکٹر محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ رک رہی ہے،تجربہ کار ڈاکٹر اس کی بات سمجھ کر آگے بات شروع کردیتا ہے:۔

Well, then he asked you to his flat .Whal did you say?

لڑکی جواب دیتی ہے۔

How did you know? I was just going to tell you that,

اس کے بعد لڑکی جو کچھ کہتی ہے، اس کو ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں، چنانچہ علمائے جدید خود بھی اس تلخ تجربے کے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزادانہ اختلاط کے بعد عصمت وعفت کا تحفظ ایک بے معنی بات ہے چنانچہ اس کے خلاف کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کی جارہی ہیں، ایک مغربی ڈاکٹر کے الفاظ ہیں:۔

There can come amoment between a man and a woman when control and judgment are impossible.

یعنی اجنبی مرد اور اجنبی عورت جب باہم آزادانہ مل رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے، جب فیصلہ کرنا اور قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی خرابیوں کو مغرب کے دردمند افراد شدت سے محسوس کر رہے ہیں، مگر اس کے باوجود اس سے اس قدر مرعوب ہیں کہ اصل بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، ایک نہایت قابل اور مشہور خاتون ڈاکٹر میرین ہلیرڈ (Marrion Hiliard) نے آزادانہ اختلاط کے خلاف سخت مضمون لکھا ہے، وہ کہتی ہیں:

As a doctor i don't believe there is such a thing as platonic relationship between aman and awoman who are alone together a good deal.

یعنی بحیثیت ڈاکٹر میں اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ عورت اور مرد کے درمیان بے ضرر تعلقات بھی ممکن ہیں، مگر اس کے باوجود یہی خاتون ڈاکٹر لکھتی ہیں:۔

’’میں اتنی غیر حقیقت پسند نہیں ہوسکتی کہ یہ مشورہ دوں کہ نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کا بوسہ لینا چھوڑ دیں، مگر اکثر مائیں اپنی لڑکیوں کو اس سے آگاہ نہیں کرتیں کہ بوسہ صرف اشتہا پیدا کرتا ہے نہ کہ وہ جذبات کو تسکین دیتا ہے۔‘‘ (ریڈرز ڈائجسٹ، دسمبر 1957ء)

خاتون ڈاکٹر یہ کہہ کر بالواسطہ طور پر چند خدائی قانون کو تسلیم کرتی ہے کہ آزادانہ اختلاط کے ابتدائی مظاہر جو مغربی زندگی میں نہایت عام ہیں، وہ جذبات میں ٹھہراؤ پیدا نہیں کرتے، بلکہ اشتہا کو بڑھا کر مزید تسکین نفس کی طرف ڈھکیلتے ہیں، اور بالآخر انتہائی جنسی جرائم تک پہنچادیتے ہیں، مگر اس کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس محرک شیطنت کو کس طرح حرام قرار دے۔

2۔اسی طرح اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کو بھی تہذیب جدید نے بڑے زور شور کے ساتھ جہالت کا قانون قرار دیا ہے، مگر تجربے نے ظاہر کردیا ہے کہ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا عین تقاضا ہے، کیونکہ چند زوجیت کے قانون کو ختم کرنا دراصل درجنوں غیر قانونی زوجیت کا دروازہ کھولنا ہے۔

یہاں میں اقوام متحدہ کے ڈیموگرافک سالنامہ 1959ء کا حوالہ دوں گا، اس میں اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ جدید دنیا میں جو صورتحال ہے، وہ یہ کہ بچے ''اندر سے کم اور باہر سے زیادہ'' پیدا ہو رہے ہیں، ڈیموگرافک سالنامہ کے مطابق ان ملکوں میں حرامی بچوں کا تناسب ساٹھ فیصدی ہے، اور بعض ممالک مثلاً پناما میں تو چار میں سے تین پادریوں کی مداخلت یا سول میرج رجسٹری کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں، یعنی 75 فی صدی بچے، لاطینی امریکہ میں اس قسم کے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

متحدہ اقوام کے اس ڈیموگرافک سالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں میں حرامی بچوں کی پیدائش کا تناسب نفی کے برابر ہے، چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) میں ناجائز بچوں کا تناسب ایک فی صدی سے بھی کم ہے، جب کہ متحدہ عرب جمہوریہ تمام مسلم ملکوں میں شاید سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوا ہے، مسلم ممالک دور جدید کی اس عام وبا سے محفوظ کیوں ہیں، اس کا جواب متحدہ اقوام کا سالنامہ مرتب کرنے والے اڈیٹروں نے یہ دیا ہے کہ چونکہ مسلم مملک میں چند زوجیت Polygamy کا رواج

ہے، اس لئے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں ہے، چندزوجیت کے اصول نے مسلم ملکوں کو وقت کے اس طوفان سے بچالیا ہے۔

(More out than in) مطبوعہ ہندستان ٹائمس، 12 ستمبر 1960ء)

اس تجربے نے ثابت کردیا ہے کہ سابق خدائی اصول ہی زیادہ صحیح اور مبنی برحقیقت تھا۔

تمدن

اسلام میں قتل عمد کی سزا موت ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہوجائیں، لیکن جدید دور ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا اسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسانی جان کے ضائع ہونے کے بعد دوسری انسانی جان کو بھی کھودیا جائے، پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے، اور پھانسی کے بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جارہی ہیں۔

اسلام نے قاتل کی جو سزا مقرر کی ہے، اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص نے سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کرکے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی جڑ آئندہ کے لئے کٹ جائے، مجرم کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آئندہ اس قسم کی ہمت نہ کرسکیں، اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے، اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے، مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہوجائے تو وہ بے سہارا رہ جاتے ہیں، ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت بھی مل جائے تو انھیں کیا فائدہ، اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کے لئے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثاء مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خوں بہا دے کر انھیں راضی کرلیں، اور وہ قاتل کو معاف کردیں، اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً دس ہزار روپئے کی رقم مل جائیگی، اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کرسکیں گے ____ مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ

دیت کی رقم میں اضافہ کر دے تا کہ بے سہارا ورثاء خسارے میں نہ رہیں۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے، اوراس کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہو گیا اس کے برعکس جن ممالک میں سزائے موت کو منسوخ کیا گیا ہے، وہاں جرائم گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئے ہیں، اعدادوشمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فیصدی تک اضافہ ہو گیا ہے، چنانچہ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت منسوخ کیا گیا۔ اوراس کے بعد نتائج دیکھ کر دوبارہ اسے بدل دیا گیا، سیلون اسمبلی نے 1956ء میں ایک قانون پاس کیا، جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کر دیا گیا، اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئے، ابتداً لوگوں کو ہوش نہیں آیا مگر 26ر ستمبر 1959ء کو جب ایک شخص نے سیلون کے وزیر اعظم بندرانائک کے مکان میں گھس کر نہایت بے دردی کے ساتھ ان کو قتل کر دیا تو سیلون کے قانون سازوں کی آنکھ کھلی، اور وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد سیلون اسمبلی کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا، جس میں چار گھنٹے کے بحث ومباحثہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت 1956ء کے قانون کو منسوخ کر کے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

معیشت

مذہب، معاشیات کی جو تنظیم کرتا ہے، اس میں ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کا سارا ڈھانچہ بنیادی طور پر، انفرادی ملکیت کے اوپر قائم ہے، یہ نظام عرصہ تک باقی رہا، [۱] مگر صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں انفرادی ملکیت کے اصول پر

---

(۱) انفرادی ملکیت کا نظام جو ساری دنیا میں جاری ہوا وہ دراصل مذہب ہی کے اثر کا نتیجہ تھا، اوراسی لئے مارکس اوراس کے متبعین نے مذہب کی شدید مخالفت کی کیونکہ اس کے بغیر انفرادی ملکیت کی اہمیت کو ذہنوں سے نکال نہیں سکتے تھے۔

زبردست تنقیدیں شروع ہوئیں، یہاں تک کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی عام فضا اس کے خلاف ہوگئی، انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے درمیان سو برس تک ایسی فضا رہی گویا انفرادی ملکیت ایک مجرمانہ قانون تھا، جو دورِ وحشت میں انسانوں کے درمیان رائج ہوگیا، اور اب جدید علمی ترقی نے اجتماعی ملکیت کا اصول دریافت کیا ہے، جو معاشیات کی بہتر تنظیم کے لئے اعلیٰ ترین اصول ہے۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار اجتماعی ملکیت کے نظام کا تجربہ شروع ہوا، زمین کے ایک بڑے حصّے میں اس کو نافذ کیا گیا، اس کے حق میں بڑے بڑے دعوے کئے گئے، بڑی بڑی امیدیں باندھی گئیں، مگر طویل تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ اجتماعی ملکیت کا نظام نہ صرف یہ کہ غیر فطری ہونے کی وجہ سے اپنے قیام کے لئے تشدد پیدا کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ وہ انسان کی ہمہ جہتی ترقی میں مانع ہے، نہ صرف یہ کہ سرمایہ داری سے بھی زیادہ ایک مرکوز اور جابرانہ نظام کا موجب ہے بلکہ خود وہ زرعی اور صنعتی پیداوار بھی اس میں ملکیتی نظام کے مقابلے میں کم حاصل ہوتی ہے، جس کے لئے آزادی اور ہمہ جہتی ترقی کی قربانی دی گئی تھی۔

یہاں میں روس کی مثال دوں گا، روس کی تمام زمینیں اس وقت سرکاری ملکیت میں تبدیل کی جاچکی ہیں، اور پورے ملک میں ''اجتماعی انتظام'' کے تحت کاشت کی جاتی ہے، ساری زمینیں سرکاری اور پنچایتی فارم کی صورت میں ہیں، نہ کہ نجی ملکیت کی صورت میں، البتہ 1935ء کے فیصلہ کے مطابق ہر کسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رہائشی مکان سے متصل اپنے ذاتی استعمال کے لئے ایک تہائی یا نصف ایکڑ اور بعض مخصوص صورتوں میں دو ایکڑ تک زمین پر قبضہ رکھ سکتا ہے، اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ اپنے مکان میں محدود تعداد میں گائے، بکری، بھیڑ اور مرغی وغیرہ پالے، 1961ء کے اعداد وشمار کے مطابق روس میں کل زیر کاشت رقبہ 204 بلین ہیکٹیر (Hectares) تھا، جس میں نجی رقبہ کی مجموعی مقدار چھ ملین ہیکٹیر تھی، یعنی کل کاشت زمین کا صرف تین فیصدی حصّہ، مگر 1961ء میں

آلو کی پیداوار کا جو تناسب تھا، وہ حسب ذیل ہے:۔

	زیر کاشت زمین	پیداوار
اجتماعی رقبہ	43,5,2,000	3,08,00,000ٹن
نجی رقبہ	45,26,000	5,35,00,000ٹن

اس طرح نجی رقبہ پر پیدا ہونے والے آلو کی مقدار گیارہ ٹن فی ہیکٹیر تھی، جبکہ سرکاری فارموں میں یہ مقدار صرف سات ٹن فی ہیکٹیر تھی، حالانکہ سرکاری فارموں کو جدید زرعی مشینیں، موزوں زمین اور معدنی کھاد وغیرہ کی وہ سہولتیں حاصل تھیں جن سے نجی رقبے قدرتی طور پر محروم تھے، اسی قسم کا تناسب دوسرے اجناس کی پیداوار میں بھی پایا جاتا ہے۔

مویشیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہے، چارہ کی کمی اور ناقص دیکھ بھال کی وجہ سے سرکاری فارموں میں کثرت سے جانور مر جاتے ہیں چنانچہ صرف ایک ریاست میں 1962ء کے گیارہ مہینوں میں مجموعی طور پر تقریباً ایک لاکھ 70 ہزار مویشی مر گئے، اس کے مقابلے میں ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود نجی طور پر پالے ہوئے مویشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اور بااعتبار تناسب وہ سرکاری جانوروں سے زیادہ مفید ثابت ہو رہے ہیں، اور زیادہ پیداوار دے رہے ہیں، چنانچہ سرکاری فارم جو کل تعداد کا 75 فی صدی مرغیوں اور مویشیوں کے مالک ہیں، انھوں نے نجی ذرائع کے مقابلے میں صرف دس (10) فیصدی زیادہ گوشت فراہم کیا اور انڈے میں تو نجی پداوار نے انھیں بہت پیچھے چھوڑ یا، 1961ء کے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

	اجتماعی رقبہ	نجی رقبہ
گوشت	48,00,000ٹن	39,00,000ٹن
دودھ	3,4,00,000ٹن	2,85,00,000ٹن
انڈا	6,300ٹن	23,000ٹن
اون	2,87,000ٹن	79,000ٹن

حتیٰ کہ یہ محدود نجی ذرائع خود حکومتی مرکزوں کو غذائی اشیا سپلائی کرتے ہیں، چنانچہ 1962ء میں صرف ایک ریاست میں حکومت نے اپنے دفاتر کا 26 فیصدی آلو اور 34 فیصدی انڈا نجی فارموں سے حاصل کیا ہے، اور اسی طرح دوسری چیزیں۔

Bulletin , Germany, November 1963

اس اجتماعی ملکیت کا آخری انجام یہ ہے کہ روس جوزار کے زمانے میں، جب کہ وہاں نجی ملکیت کا نظام رائج تھا، اناج کے معاملے میں دنیا کے چند بڑے برآمدی ملکوں میں سے تھا، اس نے 1963ء میں کناڈا، آسٹریلیا اور امریکہ سے پندرہ ملین ٹن گیہوں خریدا ہے ، اور یہ صورت حال مسلسل جاری ہے، چنانچہ 560۔1941ء میں اس نے امریکہ سے بارہ لاکھ پچاس ہزار ٹن غلہ خریدا ہے، اسی طرح بعد کے سالوں میں بھی یہی حال دوسرے اشترا کی ملک چین کا بھی ہے۔

Bulletin Oct. 1963

اس تجربے سے معلوم ہوا کہ مذہب کا قانون جس ذہن سے نکلا ہے، وہ انسانی فطرت کو زیادہ جاننے والا ہے، اور اس کے مسائل کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو تمدن کی تعمیر کے لئے ہمیں درکار ہے، اس کا واحد اور حقیقی جواب صرف مذہب کے پاس ہے، مذہب ہمیں حقیقی قانون ساز کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ قانون کی موزوں ترین اساس فراہم کرتا ہے، وہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ صحیح ترین بنیاد دیتا ہے، جس کی روشنی میں ہم زندگی کا مکمل نقشہ بنا سکیں، وہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان قانونی مساوات پیدا کرنے کی واحد صورت ہے، وہ قانون کے لئے وہ نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے، جس کی عدم موجودگی میں قانون عملاً بیکار ہو کر رہ جاتا ہے، وہ سوسائٹی کے اندر وہ موافق فضا پیدا کرتا ہے، جو کسی قانون کے نفاذ کے لئے ضروری ہے، اس طرح مذہب ہمیں وہ سب کچھ دیتا ہے، جس کی ہمیں اپنے تمدن کی تعمیر کے لئے ضرورت ہے، جب کہ لامذہبیت ان میں سے کچھ بھی نہیں دیتی اور نہ حقیقتاً دے سکتی ہے۔

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

فریڈرش انگلس نے کہا ہے ـــــــــ ''آدمی کوسب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہئے، اس کے بعد ہی وہ فلسفہ وسیاست کے مسائل پر غور کر سکتا ہے۔''
مگر حقیقت یہ ہے انسان سب سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ یہ سوال ہے کہ ''میں کیا ہوں' یہ کائنات کیا ہے' میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوگی'' یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں، آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں، سورج اس کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ہوا اس کو زندگی بخشتی ہے مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو، وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے، اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لئے اس دنیا میں آ گیا ہوں ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے، مگر انسان بہر حال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں، کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔

انگلس کو دنیا ایک ملحد انسان کی حیثیت سے جانتی ہے، مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا ردعمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا، اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گزری، مگر جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا

ہوگئی، اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے خط میں اس طرح لکھتا ہے:

''میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو جائے، جب سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں یہی دعا کرنا میرا مشغلہ ہے، میں تمہارے عقیدے کو قبول نہیں کر سکتا، میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے امڈا چلا آرہا ہے، میری آنکھیں رو رہی ہیں، لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندۂ درگاہ نہیں ہوں، مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہونچ جاؤں گا، جس کے دیدار کا میں دل وجان سے متمنی ہوں، اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے، یہ روح القدس کی جھلک ہے، اگر انجیل مقدس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا۔''

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں بھرا تھا، مگر اس کی تسکین نہ مل سکی اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک خالق و مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے، وہ اس کے لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے، ''خدا میرا خالق ہے، اور میں اس کا بندہ ہوں'' یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص اول روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے، ایک پیدا کرنے والے آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے، اس کی روح اندر سے زور کرتی ہے جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا، اسے پالیں، اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کے صحیح مرجع کو پالینا ہے، اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کر دے، 15/اگست 1947ء کو جب ہندستان کے سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر ملک

کا قومی جھنڈا لہرایا گیا تو یہ منظر دیکھ کر ان قوم پرستوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے، یہ آنسو دراصل آزادی کی دیوی کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا ــــــ یہ اپنے معبود کو پا لینے کی خوشی تھی، جس کے لئے انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا تھا، اسی طرح ایک لیڈر جب ''قوم کے باپ'' کی قبر پر جا کر پھول چڑھاہے، اور اس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہوجاتا ہے، تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دوہراتا ہے جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کے لئے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے، ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ اتارتا ہے، اور اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدت کے جذبات نذر کر رہا ہوتا ہے، اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بنائے اور اپنے جذبات کی قربانی اس کے آگے پیش کرے۔

مگر خدا کے سوا جن جن صورتوں میں آدمی اپنا یہ نذرانہ پیش کرتا ہے وہ سب شرک کی صورتیں ہیں، اور ''اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ '' (شرک سب سے بڑا ظلم ہے) ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا مثلاً ڈبہ کے ڈھکن سے آپ بچے کی ٹوپی کا کام لینا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا، گویا آدمی جب اپنے نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لئے خدا کو چھوڑ کر کسی اور طرف لپکتا ہے، جب وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا سہارا بناتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیتا ہے، وہ ایک صحیح جذبے کا غلط استعمال کرتا ہے۔

یہ جذبہ چونکہ ایک فطری جذبہ ہے، اس لئے ابتداً وہ ہمیشہ فطری شکل میں ابھرتا ہے، اس کا پہلا رخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے، مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں، اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے مانوس ہوجاتا ہے تو اس کو لذت ملنے لگتی ہے، برٹ رنیڈ رسل اپنے بچپن میں ایک کٹر مذہبی آدمی تھا، وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا ــــــ اسی زمانے میں ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا

''تمہاری پسندیدہ دعا کون سی ہے'' چھوٹے رسل نے جواب دیا ''میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں اور اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں'' اس زمانے میں خدا برٹ رنیڈ رسل کا معبود تھا، لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے خود اس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے رجحانات ابھرنے لگے، اور اب برٹ رنیڈ رسل ایک ملحد انسان ہے جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ ہیں، 1959ء کا واقعہ ہے، بی، بی، سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام میں فری مین نے رسل سے پوچھا ــــــ ''کیا آپ نے مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے؟'' رسل نے جواب دیا ''جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہم کنار ہو گیا تھا، جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں ــــــ یہ ایک ابدی دنیا تھی، وقت کی قید سے آزاد دنیا، مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا۔''

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بنانے سے انکار کر دیا، مگر معبود کی ضرورت سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا، اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا، وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا، اور صرف یہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کے لئے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں جو صرف خدا ہی کی صفت ہو سکتی ہے۔ ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی! کیونکہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا جو دراصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔

''نہرو رکوع میں'' ــــــ اگر یہ خبر کسی دن اخبار میں چھپے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ واقعہ ہے لیکن ہندستان ٹائمس (دہلی) کی 3/ اکتوبر 1963ء کی اشاعت کے آخری صفحہ پر شائع شدہ تصویر اس کی تصدیق کر رہی ہے، اس تصویر میں نظر آ رہا ہے کہ ہندستان کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو دوزانو ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر رکوع کی مانند جھکے ہوئے

ہیں، یہ گاندھی جینتی کے موقع کی تصویر ہے، اور نہرو راجگھاٹ میں گاندھی سمادھی پر قوم کے باپو کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

اس قسم کے واقعات ہر سال اور ہر روز ساری دنیا میں ہوتے ہیں، لاکھوں ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں _____ وہ اپنے خودساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ ''الٰہ'' انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے، انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے الٰہوں کے سامنے جھکنا پڑے گا، کیونکہ ''الٰہ'' کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پر نہیں کرسکتی۔

مگر بات صرف اتنی نہیں ہے، اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں، وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں، جیسے کوئی بے ماں بچہ پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبالے اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے، ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، اس کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں، جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو میں نے پائی ہے۔

آزادی سے بارہ سال پہلے 1935ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:۔

''میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا، اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کرسکتا، کتاب زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔''

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں، اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصہ پر بلاشرکت حکومت کر رہے ہیں، مگر اس یافت نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے

رہے کہ کتاب زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی تک بند ہیں، اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا، جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے، جنوری 1964ء کے پہلے ہفتہ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے، پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

> ''میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، ہم کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں، میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں۔'' (National Herald, jan 6, 1964)

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جو ان تمام لوگوں کی روحوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا رہتا ہے، جنھوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبو بنانے سے انکار کیا، دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں، مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے، اور انھیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

خدا سے محروم قلوب کا یہ حال صرف ایک دنیوی بے اطمینانی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے، یہ چند روزہ مسئلہ نہیں بلکہ دائمی مسئلہ ہے، یہ دراصل اس تاریک اور بے سہارا زندگی کے آثار ہیں، جس کے کنارے وہ کھڑا ہوا ہے، یہ اس ہولناک زندگی کی ابتدائی گھٹن ہے، جس میں ایسے ہر آدمی کو موت کے بعد داخل ہونا ہے، اور اس خطرے کا ایک پیشگی الارم ہے، جس میں اس کی روح کو بالآخر مبتلا ہونا ہے، مختصر یہ کہ وہ اس جہنم کا دھواں ہے جو ہر کافر و مشرک کے لئے تیار کی گئی ہے گھر میں آگ لگ جائے تو اس کا دھواں سوتے ہوئے آدمی کے دماغ میں گھس کر اس کو آنے والے خطرے سے باخبر کرتا ہے، اگر وہ

دھوئیں کی گھٹن سے جگ گیا تو اپنے آپ کو بچالے جائے گا، لیکن جب شعلے قریب آجائیں تو وہ انتباہ کا وقت نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہاری بے حسی اور بے خبری نے تمہارے لئے مقدر کردیا ہے کہ تم آگ میں جلو۔

کیا کوئی ہے جو وقت سے پہلے بیدار ہوجائے، کیونکہ بیداری وہی ہے، جو وقت سے پہلے ہو، وقت پر بیدار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

2۔میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (Michael Brecher) نے پنڈت جواہرلال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے، اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی، نئی دہلی کی ایک ملاقات میں 13 رجون 1956ء کو انھوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:۔

''آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں، اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے؟''

ہندستان کے سابق وزیراعظم نے جواب دیا:۔

''میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار Moral Standards کہہ لیجئے، یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے، ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم، ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے، میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علٰیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے، یہ ایک مسئلہ ہے۔''

Nehru : A Polatacal Biography, London , 1959, p.607-8

یہ سوال وجواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے، جس میں آج وہ شدت

سے گرفتار ہے، افراد کو دیانت واخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا، مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے سینکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے، پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے خوش اخلاقی کا ہفتہ (Courtesy Week) منایا جاتا ہے، مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کو افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے ''اخلاق'' کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے، بے ٹکٹ مسافروں کو بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لئے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ ''بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے Ticktless travel is a social evil

مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا تو یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ''سماجی گناہ'' کا لفظ وہ احساس پیدا نہیں کرسکتا جو نظم وضبط کی تعمیل کے لئے محرک بن سکے، پریس کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا (Crime does not pay) مگر جرائم بڑھتی ہوئی رفتار بتاتی ہے کہ دنیوی نقصان کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو جرم سے باز رکھے، تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کردی جاتی ہیں ____ ''رشوت لینا اور رشوت دینا پاپ ہے'' مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں عین انھیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زور شور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈہ رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں، ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں۔ ''ریلوے قوم کی ملکیت ہے، اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے'' مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں، اور بجلی کے بلب غائب کردیتے ہیں، تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ''قوم'' کے مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی

مفاد کوقربان کردے، اجتماعی ذرائع کوذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنا ملک وقوم سے غداری ہے" ایک طرف لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہورہا ہے، دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لئے ناکام ہورہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبہ پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے، اسی طرح ساری قومی زندگی کی انتہائی کوشش کے باوجود ان معیاروں سے محروم ہوگئی ہے جوقومی تعمیر کے لئے ضروری ہیں، اوران معیاروں کو پیدا کرنے کیلئے جتنے ذرائع استعمال کئے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لاکر ڈال دیا ہے، اس کو اس پٹری سے محروم کردیا ہے، جس کے اوپر چل کروہ اپنا سفر بحسن وخوبی طے کرسکتی ہے، زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہوگئی ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے، وہ زندگی کے لئے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے، یہی وہ تنہا بنیاد ہے، جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے، اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔

ہندستان میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر چسٹر باولز (Chester Bowles) لکھتے ہیں:۔

> "زیر ترقی ممالک صنعتی ترقی حاصل کرنے کے سلسلے میں دوطرح کے مسائل سے دوچار ہیں اور دونوں نہایت پیچیدہ ہیں، ایک یہ سرمایۂ خام اشیاء اورفنی مہارت جوانھیں حاصل ہیں، ان کوکس طرح زیادہ بہتر طور پر استعمال کریں۔۔دوسرا پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق عوام اورادارہ سے ہے، صنعت کوتیزی سے آگے بڑھانے کے ساتھ ہمیں یہ تیقن بھی حاصل کرنا ہے کہ وہ جتنی خرابیوں کو دور کرے اس سے زیادہ خرابیاں پیدا نہ کردے، مہاتما گاندھی کے الفاظ میں "سائنسی معلومات اور دریافتیں

محض حرص کو بڑھانے کا اوزار ثابت ہوسکتی ہیں، اصل قابل لحاظ چیز انسان ہے۔‘‘

The Making of a Society Delhi 1963. p 68-69

باولز کے الفاظ میں عوام گویا وہ ماحول ہیں، جس کے اندر ترقیاتی پروگرام جاری ہوتے ہیں، ترقی کے ضروری سامان ــــــ سرمایہ اور فنی مہارت وغیرہ تمدنی اور سیاسی خلا میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتے۔ (ص 31)

یہ خلا کیسے پر ہو اور وہ ماحول کیسے بنے جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانتداری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں، اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہوسکتا، بے خدا تہذیب کے اندر ہر ترقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے، اس کا اجتماعی پروگرام یہ ہے کہ ایک پرامن اور خوشحال سماج کی تعمیر کی جائے، مگر اس کے ساتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ ــــــ ’’انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے‘‘ تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کردیتے ہیں، وہ پورے سماج کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں، سماج کے افراد کو اس کے خلاف بنا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اب تک اپنے مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تمام مادی فلسفے زندگی کا بہتر نظام بنانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

مادی خوشی کو زندگی کا مقصد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش پوری کرنا چاہے، لیکن اس محدود دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے کو متاثر کئے بغیر یکساں طور پر اپنی اپنی خواہش پوری کرسکے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی جب اپنی تمام خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ دوسروں کے لئے مصیبت بن جاتا ہے، فرد کی خوشی، سماج کی خوشی کو درہم برہم کردیتی ہے، ایک محدود آمدنی والا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی آمدنی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہورہی ہے تو وہ حق ماری، بددیانتی، چوری، رشوت اور غبن کے

ذریعہ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرتا ہے، مگر اس طرح جب وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے تو وہ سماج کو اسی محتاجی میں مبتلا کر دیتا ہے، جس میں وہ خود پہلے مبتلا تھا۔

جدید دنیا ایک عجیب وغریب قسم کی نہایت خطرناک مصیبت میں مبتلا ہے، جس کا تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، یہ جرم کم سنی (Juvenile Delinquency) ہے، جو جدید زندگی کا ایک لازمہ بن چکا ہے، یہ کمسن مجرمین کہاں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی پیدائش کا سرچشمہ وہی مادی خوشی کو پورا کرنا ہے، ایک شادی شدہ جوڑا کچھ دنوں ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں، اور اپنی جنسی خوشی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ نیا جسم اور نیا چہرہ تلاش کریں، اس وقت وہ طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو جاتے ہیں، اس علیٰحدگی کی قیمت سماج کو چند ایسے بچوں کی شکل میں ملتی ہے، جو اپنے ماں باپ کی موجودگی میں ''یتیم'' ہو گئے ہیں، یہ بچے والدین سے چھوٹنے کے بعد ماحول کے اندر اپنی کوئی جگہ نہیں پاتے، ایک طرف وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں، اور دوسری طرف ماحول سے بیزار، یہ صورتِ حال بہت جلد انھیں جرائم تک پہنچا دیتی ہے، سر الفرڈ ڈیننگ Alfred denning نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''اکثر کمسن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں (Broken Homes) سے نمودار ہوتے ہیں۔''

(THe Changing Law, p.111)

اسی طرح موجودہ زندگی میں تمام خرابیوں کی جڑ صرف یہ واقعہ ہے کہ جدید دنیا کا انفرادی فلسفہ اور اس کے اجتماعی مقاصد ایک دوسرے سے متضاد ہیں، وہ تمام واردات جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں، اور ان کو جرم، برائی اور بدعنوانی کہتے ہیں، وہ دراصل کسی شخصی یا پارٹی یا قوم کی اپنی مادی خوشی حاصل کرنے کی کوشش ہی ہوتی ہے، اور اسی کوشش کا سماجی انجام قتل، بدکاری، لڑائی، اغوا، جعل سازی، ڈاکہ، لوٹ کھسوٹ، جنگ اور اس طرح کی دوسری بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تضاد بتا تا ہے کہ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا کہ دنیا کی مادی چیزوں کے بجائے آخرت میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو مقصد بنایا جائے ، یہی وہ مقصد ہے، جوفرد اور سماج کو باہمی تضاد سے بچا کر موافق ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے ____ نظریۂ آخرت کی یہ خصوصیت جہاں یہ ثابت کرتی ہے کہ وہیں وہ واحد بنیاد ہے، جوترقیاتی اسکیموں کو صحیح طور پر کامیاب کرسکتی ہے، اسی کے ساتھ وہ بھی ثابت کرتی ہے کہ وہی حقیقی مقصد ہے، کیونکہ غیر حقیقی چیز زندگی کیلئے اتنی اہم اور اس سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔

موجودہ زمانے میں طب اور سرجری میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ سائنس موت اور بڑھاپے کے سوا ہر جسمانی تکلیف پر قابو پاسکتی ہے، مگر اسی کے ساتھ بیماری کی اقسام میں نہایت تیزی سے ایک نئے نام کا اضافہ ہو رہا ہے ۔ اعصابی بیماری Nervous Diseases یہ ''اعصابی بیماریاں'' کیا ہیں، یہ دراصل اسی تضاد کا ایک عملی ظہور ہے، جس میں جدید سوسائٹی شدت سے مبتلا ہے، مادی تہذیب نے انسان کے اس حصّے کو جونمکیات معدنیات اور گیسوں کا مرکب ہے، ترقی دینے کی کافی کوشش کی، مگر انسان کا وہ حصّہ جوشعور، خواہش اور ارادہ پر مشتمل ہے، اور اس غذا سے اس کو محروم کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا حصہ تو بظاہر فربہ اور خوش منظر دکھائی دینے لگا، مگر دوسرا حصّہ جو اصل انسان ہے، وہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہو گیا۔

موجودہ امریکہ کے بارے میں وہاں کے ذمہ دار ذرائع کا اندازہ ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اسّی (80) فیصدی مریض ایسے ہیں جن کی علالت بنیادی طور پر نفسیاتی سبب Psychic Causation کے تحت واقع ہوتی ہے، ماہرین نفسیات نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا ہونے کے چند اہم ترین وجوہ یہ ہیں ، جرم، ناراضگی ، اندیشہ، پریشانی ، مایوسی ، تذبذب ، شبہ، حسد، خودغرضی اور اکتاہٹ (Boredom) یہ سارے عوارض ، اگر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو بے خدا

زندگی کا نتیجہ ہیں، خدا پر ایمان آدمی کے اندر وہ اعتماد پیدا کرتا ہے، جو مشکلات میں اس کے لئے سہارا بن سکے، وہ ایسا برتر مقصد اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، جس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ سکے، وہ اس کو ایسا محرک دیتا ہے، جو سارے اخلاقی محاسن کی واحد بنیاد ہے، وہ عقیدے کی وہ طاقت دیتا ہے، جس کے متعلق ڈاکٹر سر ولیم اوسلر Sir William Osler نے کہا ہے "وہ ایک عظیم قوت محرکہ (Gret Moving Force) ہے، جس کو نہ کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے، اور نہ لیبورٹری میں اس کی آزمائش کی جا سکتی" یہی عقیدے کی طاقت دراصل نفسیاتی صحت کا خزانہ ہے، جو نفسیات اس سرچشمہ سے محروم ہو وہ "بیماریوں" کے سوا کسی اور انجام سے دوچار نہیں ہو سکتی، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وقت کے ماہرین نے نفسیاتی یا اعصابی عوارض کا کھوج لگانے میں تو کمال درجے کی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، مگر ان نو دریافت بیماریوں کا صحیح علاج تجویز کرنے میں وہ سخت ناکام ہوئے ہیں، ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں "نفسیاتی علاج کے ماہرین (Psychiatrists) صرف اس تالے کی باریک تفصیلات بتانے میں اپنی کوشش صرف کر رہے ہیں، جو ہمارے اوپر صحت کے دروازے بند کرنے والا ہے۔"

جدید معاشرہ بیک وقت دو متضاد عمل کر رہا ہے، ایک طرف وہ مادی ساز و سامان فراہم کرنے میں پوری قوت صرف کر رہا ہے، دوسری طرف مذہب کو ترک کر کے وہ حالات پیدا کر رہا ہے، جس سے زندگی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائے، وہ ایک طرف دوا کھلا رہا ہے، اور دوسری جانب زہر کا انجکشن دے رہا ہے، یہاں میں ایک مریکی ڈاکٹر ارنسٹ اڈولف (Paul Ernest Adolph) کا ایک اقتباس نقل کروں گا جو اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ شہادت فراہم کرتا ہے:۔

"جن دنوں میں میڈیکل اسکول میں زیر تعلیم تھا، میں ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوا

جوزخم ہوجانے کی صورت میں جسم کے اخلاط (Body Tissues) میں رونما ہوتی ہیں، خوردبین کے ذریعہ نسیجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نسیجوں پر جو مختلف موافق اثرات کے واقع ہونے سے زخم کا اطمینان بخش اندمال ہوجاتا ہے، اس کے بعد جب تعلیم ختم کرکے میں عملاً ڈاکٹری کے پیشے میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا کہ میں زخم اور اس کے اندمال کے طریقوں کو اس حد تک جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر موافق نتیجہ پیدا کرسکتا ہوں جبکہ میں اس کے ضروری طبی وسائل مہیا کرکے اس کو استعمال میں لاؤں، لیکن جلد ہی میری اس خوداعتمادی کو صدمہ پہنچا، مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی میڈیکل سائنس میں ایک ایسے عنصر کو نظر انداز کردیا تھا، جو سب سے زیادہ اہم ہے۔۔۔۔۔یعنی خدا۔

اسپتال میں جن مریضوں کی نگرانی میرے سپرد کی گئی ان میں ایک سترّ (70) سال کی بوڑھی عورت تھی، جس کا کولھا زخمی ہوگیا تھا، اکسرے تصاویر کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ اس کی نسیجیں (Tissues) بڑی تیزی سے ٹھیک ہورہی ہیں، میں نے اس سرعت کے ساتھ شفایابی پر اس کو مبارکباد پیش کی، انچارج سرجن نے مجھے ہدایت کی کہ اس خاتون کو ۲۴ گھنٹے میں رخصت کردیا جائے، کیونکہ اب وہ کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی ہے۔

اتوار کا دن تھا، اس کی بیٹی ہفتہ وار ملاقات کے معمول کے مطابق اسے دیکھنے آئی، میں نے اس سے کہا کہ چونکہ اس کی ماں اب صحت یاب ہے، اس لئے وہ کل آکر اسے اسپتال سے گھر لے جائے، لڑکی اس کے جواب میں کچھ نہیں بولی اور سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی، اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس کے بارے میں مشورہ کیا ہے، اور یہ طے ہوا ہے کہ وہ اس کو اپنے گھر نہ لے جاسکیں گے، اس لئے زیادہ بہتر انتظام کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی دارالضعفاء (Old People's Home) میں پہنچادیا جائے۔

چند گھنٹوں کے بعد جب میں اس بڑھیا کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پر جسمانی انحطاط طاری ہو رہا ہے، چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ مرگئی ــــــ کولھے کے زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کے صدمے کی وجہ سے

(Not of her broken hip, but of a broken heart)

ہم نے ہر قسم کی ممکن طبی امداد اسے پہنچائی، مگر وہ جانبر نہ ہوسکی، اس کے کولھے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی تو بالکل درست ہوچکی تھی، مگر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا، وٹامن، معدنیات اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ لانے کے لئے سارے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہوئی، یقینی طور پر اس کی ہڈیاں جڑ چکی تھیں، اور وہ ایک مضبوط کولھے کی مالک ہوچکی تھی، مگر وہ بچ نہ سکی، کیوں، اس لئے کہ اس کی صحت کے لئے اہم ترین عنصر جو درکار تھا، وہ وٹامن نہیں تھا، نہ معدنایت تھے اور نہ ہڈیوں کا جڑنا تھا، یہ صرف امنگ (Hope) تھی، اور جب زندگی کی امنگ ختم ہوگئی تو صحت بھی رخصت ہوگئی۔

اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر کیا، کیونکہ اس کے ساتھ مجھے شدید احساس تھا کہ اس بوڑھی خاتون کے ساتھ ہرگز یہ حادثہ پیش نہ آتا، اگر یہ خاتون خدائی امید (God of Hope) سے آشنا ہوتی، جس پر ایک عیسائی کی حیثیت سے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔"

The Evidence of God, p.212.14

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید ترقی یافتہ دنیا کس قسم کے تضاد سے دوچار ہے، وہ ایک طرف سارے علوم کو اس نہج پر ترقی دے رہی ہے، جس سے خدا کا وجود حرف غلط ثابت ہوجائے، تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو اس ڈھنگ سے چلایا جا رہا ہے، جس سے خدا اور مذہب کے احساسات دلوں سے رخصت ہوجائیں، اس طرح روح ــــــ اصل انسان ـــ کو موت کے خطرے میں مبتلا کر کے اس کے جسم ــــــ مادی وجود ــــــ کو ترقی دینے کی سعی کی جارہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ بہترین ماہرین اس کی ٹوٹی

ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، عقیدے کی اندرونی طاقت کی محرومی کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اور بظاہر جسمانی صحت کے باوجود وہ موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔

یہی وہ تضاد ہے، جس نے آج پوری انسانیت کو تباہ کر رکھا ہے، خوش پوش جسم حقیقی سکون سے محروم ہیں، عالی شان عمارتیں اجڑے ہوئے دلوں کا مسکن ہیں، جگمگاتے ہوئے شہر جرائم اور مصائب کا مرکز ہیں، شان دار حکومتیں اندرونی سازش اور بے اعتمادی کا شکار ہیں، بڑے بڑے منصوبے کردار کی خامی کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں ــــــ غرض مادی ترقیات کے باوجود زندگی بالکل اجڑ گئی ہے، اور یہ سب نتیجہ ہے صرف ایک چیز کا ــــــ انسان نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا، اس نے اس سرچشمہ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، جو اس کے خالق و مالک نے اس کے لئے مہیا کیا تھا۔

نفسیاتی امراض کی نوعیت جو اوپر بیان کی گئی ہے، وہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ خود اس فن کے علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے، نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر ینگ (C.G.jung) نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ''پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے، میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہونچنے والے تمام لوگ ــــــ جو کہ 35 سال کے بعد کہی جاسکتی ہے ــــــ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا، جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیے میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیرووٴں کو دیتے رہے ہیں، اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقۃً اس

وقت تک شفایاب نہ ہوسکا، جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا۔‘‘(۱)

یہ الفاظ اگرچہ سمجھنے والے کے لئے بجائے خود بالکل واضح ہیں، تاہم اگر میں نیو یارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے، کریسی ماریسن کے الفاظ نقل کردوں تو بات بالکل مکمل ہوجائے گی:۔

’’ادب واحترام، فیاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات (Divine Attributes) کہا جاسکتا ہے، وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہوسکتیں جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب وغریب قسم ہے، جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھا لیتا ہے، عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہوجائے گی، نظم، بے نظمی میں تبدیل ہوجائے گی، ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہوجائے گا۔۔۔۔۔اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی، ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں۔‘‘

Man Does not Stand Alone, p.123

---

(۱) Quoted by C.A.Coulson, Science and Christan Belief, p.110

آخری بات

اگر کسی دن ماونٹ پیلومر کی رصدگاہ سے یہ اعلان ہو کہ زمین کی قوتِ کشش ختم ہوگئی ہے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا، کیوں کہ اس خبر کے معنی یہ ہیں کہ زمین کا پورا کرہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہوجائے اور چند ہفتوں کے اندر سورج کے عظیم الاؤ میں اس طرح جا گرے کہ اس کی راکھ بھی یہ بتانے کے لئے باقی نہ رہے کہ زمین نام کی کوئی چیز کبھی اس کائنات میں موجود تھی، جس میں اربوں انسان بستے تھے، اور بڑے بڑے تمدنی شہر آباد تھے۔

مگر ماہرین اعدادوشمار کی یہ خبر کہ ہر منٹ میں ساری دنیا کے اندر ایک سو انسان مرجاتے ہیں، ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ گھبرادینے والی بات ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک رات اور دن میں تقریباً پندرہ لاکھ انسان ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ 24 گھنٹے میں پندرہ لاکھ! اس صورت حال میں یہ واقعہ مزید شدت پیدا کردیتا ہے کہ پندرہ لاکھ کا یہ انتخاب تابکار عناصر کے برقی ذرات کی طرح بالکل نامعلوم طور پر ہوتا ہے، کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے لئے جن پندرہ لاکھ انسانوں کی موت کی فہرست تیار ہورہی ہے، اس میں اس کا نام شامل ہے یا نہیں، گویا ہر شخص ہر آن اس خطرے میں مبتلا ہے کہ قضاوقدر کا فیصلہ اس کے حق میں موت کا فرشتہ بن کر آپہنچے۔

یہ جانے والے لوگ کہاں جاتے ہیں، اس کا جواب آپ کو معلوم ہو چکا ہے، کہ وہ کائنات کے مالک کے سامنے اپنے کارنامۂ زندگی کا حساب دینے کے لئے حاضر کئے جاتے ہیں، انھیں اس لئے موت آتی ہے کہ دوسری دنیا میں ان کی وہ مستقل زندگی شروع ہو جو دنیا کے عمل کے مطابق اچھی یا بری انھیں گزارنی ہے، یہ زندگی یا تو بے حد آرام کی زندگی ہے، یا بے حد تکلیف کی

زندگی ، یہ گھڑی بہر حال آ کر رہے گی ، ہم سب لوگ ایک ایسے ممکن انجام سے دو چار ہیں جس سے ہم صرف بچنے کی فکر کر سکتے ہیں، اس کے آنے کو ہم ٹال نہیں سکتے۔

پھر انسان تو کس انتظار میں ہے، کیا تجھ کو ہوشیار کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی نہیں کہ تو اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکتا، کیا تجھے اپنی زندگی کو بدلنے کے لئے اس سے بڑے کسی محرک کی ضرورت ہے کہ اگر تو نے دنیا میں اپنی زندگی نہیں بدلی تو تجھ کو جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیش کے لئے جلنا ہے، کیا تو اس سے نہیں ڈرتا کہ دنیا میں جب تیری قبر پر تیرے معتقدین پھول چڑھا رہے ہوں تو آخرت میں خدا کے فرشتے تیری باغیانہ روش کے جرم میں تجھ پر کوڑے برسائیں۔

وہ دن جو بڑا سخت دن ہوگا، وہ جب آئے گا تو سارے زمین و آسمان کو الٹ دے گا، وہ ایک نئ دنیا بنائے گا، جہاں سچ سچ کی شکل میں ظاہر ہوگا اور جھوٹ جھوٹ کی شکل میں ،کوئی نہ خود دھوکے میں رہے گا ،اور نہ دوسرے کو دھوکا دے سکے گا، نہ کسی کا زور چلے گا، نہ سفارش کام آئے، اس دن تیرے الفاظ کے گھروندے بکھر جائیں گے، تیرے جھوٹے فلسفے بے دلیل ثابت ہوں گے، تیری فرضی امیدیں تجھے دھوکا دے دیں گی، تیرا اقتدار تیرے کچھ کام نہ آئے گا، تیرے خودساختہ بت تجھے جواب دے دیں گے،آہ !انسان کس قدر بے سہارا ہوگا اس روز، حالانکہ اسی دن اس کو سب سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوگی، وہ کتنا محروم ہوگا، اس روز، حالانکہ اسی دن وہ سب سے زیادہ پانے کا محتاج ہوگا۔

انسان! آج ہی سن لے، کیونکہ کل تو سنے گا مگر اس وقت تیرا سننا بے کار ہوگا، آج ہی سوچ لے کیونکہ موت کے بعد تو سوچے گا مگر اس وقت کا سوچنا تجھے کچھ کام نہ آئے گا، خدا کا راستہ تیرے سامنے کھلا ہوا ہے، اس کو پکڑ لے، خدا کے رسول پر ایمان لا، خدا کی کتاب کو اپنی زندگی کا دستور بنا، آخرت کے دن کے لئے تیاری کر______ یہی تیری کامیابی کا راستہ ہے، اسی میں وہ زندگی چھپی ہوئی ہے، جس کی تجھے تلاش ہے۔